الٹا درخت

کرشن چندر

الٹا درخت

کرشن چندر

ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے اسکولوں، کالجوں اور لائبریریوں
کے لئے منظور کیا

پروڈکشن — بجے چوپڑہ
کتابت — اعجاز نبی

ناشر
اوپندر ناتھ

قیمت
۷/- روپے

رجت بک ہاؤس
۳۶ چیتک ہاؤسنگ سوسائٹی پہلی منزل
سیکٹر ۹ - روہنی - دلی ۱۱۰۰۸۵

ULTA DREAKTH
Krishan Chander
Price Rs.70/=

2001

Rajat Book House
36 Chetak Housing Society
(1st Floor) Ahinsa Marg
Sector-9, Rohini- Delhi-85

رنجن کے نام

کرشن چندر
یکم جولائی ۱۹۵۴ء
بمبئی

دیباچہ

کرشن چندر کا نام اُردو افسانے میں تجربات سے عبارت ہے۔ مواد اور ہیئت کے جتنے تجربے کرشن چندر نے کئے ہیں اُردو کے کسی اور افسانہ نگار نے نہیں کئے۔ ادب میں تجربے کی اہمیت کو شاید کرشن چندر سے زیادہ کسی دوسرے افسانہ نگار نے اتنا نہیں سمجھا ہے۔

"الٹا درخت" کرشن چندر کا سب سے تازہ اور سب سے نیا تجربہ ہے یہ تجربہ مواد کا بھی ہے اور ہیئت کا بھی۔ اور اس تجربے کے نتیجے کے طور پر اُردو ادب میں ایک فنطاسیہ Phantasy کا اضافہ ہوا ہے یہ فنطاسیہ ایک ناولٹ کے روپ میں ہے جسے کرشن چندر نے بچوں کے لئے لکھنا شروع کیا یہ چھپا بھی بچوں کے ایک رسالے میں۔ مگر اس کی تخلیق کے دوران میں احتیاط کے باوجود ایک چوک ہو گئی۔ کرشن چندر کا ارادہ محض اپنے تخیل سے کام لے کر ایک تخیلی کہانی لکھنے کا تھا۔ لیکن نہ جانے کیسے تخیل کے ساتھ ساتھ اس کا بالغ شعور بھی اس تخیل سے مس ہوتا رہا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ یہ معصوم تخلیق بڑے خفیف ڈھنگ سے بیٹری کی طرح چارج ہوتی رہی اور اب یہ ایک فنطاسیہ ہی نہیں بلکہ ایک زبردست طنزیہ تمثیل بھی ہے۔

اس ناول کا مواد بھی کچھ عجیب مرکب ہے۔ اس میں بچوں کی روایتی کہانیوں کے دیو بھی ہیں، جادوگر بھی ہیں، خضر نما رحمدل بوڑھا بھی ہے، سلیمانی ٹوپی اور اڑنے والی چھڑی بھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں جادوگر الیکشن بھی لڑتے ہیں اور فلم ڈائرکٹر اُلو بنے نظر آتے ہیں اور مشینوں کے شہر میں سرمایہ دار کا اکلوتا بیٹا مشینوں کے بٹن دباتا نظر آتا ہے۔ ایک معصوم قاری کے لئے یہ عجیب و غریب اور دلچسپ داستان ہے۔ بچوں کے لئے اس میں دلچسپی کا پورا مواد موجود ہے لیکن پھر بھی یہ تخلیق "سنجیدہ ادب Serious Literature" کا ایک شاہکار ہے۔

اور جو چیز اس لطیف کہانی کو سنجیدہ ادب کے زمرے میں شامل کرتی ہے وہ ہے مصنف کا بالغ سیاسی اور سماجی شعور۔ اس شعور کے لمس سے یہ ساری کہانی ایک طنزیہ تمثیل بن گئی ہے۔ اور ہر تخیلی پیکر ایک گہری رمزیت اور ہر واقعہ ایک گہری معنویت کا حامل بن گیا ہے۔

اصل کہانی اس جگہ سے شروع ہوتی ہے جہاں یوسف تحت الثریٰ Under World میں پہنچ جاتا ہے۔ یہاں کرشن چندر اپنے طنز کو پوری طرح آزاد کر دیتا ہے۔ خیالی سے خیالی تصویر ایک گہری معنویت کی حامل ہو جاتی ہے۔ آوازوں کا گنبد ایک خیالی چیز نہ رہ کر ادب اور فلسفہ کی لازوال آواز اور انقلابی قوت کا رمز یہ Symbol بن جاتا ہے۔ کالا دیو نسل اور رنگ کے امتیازات سے پیدا ہونیوالے ردعمل کا مظہر ہے۔ رنگ اور نسل کے فرق کو کرشن چندر نے کس قدر سادہ اور فطری دلیل سے غلط ثابت کیا ہے۔

یوسف نے کہا۔ "ایک سفید آدمی کو میرے سامنے لاؤ۔"

ایک سفید غلام یوسف کے سامنے لایا گیا۔ یوسف نے کہا۔ "اس کی انگلی کاٹو۔"

"ہاہا۔ بڑی خوشی سے۔" دیو نے سفید آدمی کی انگلی کاٹ دی۔ اس میں سے لال لال خون بہنے لگا۔

یوسف نے کالے دیو سے کہا۔ "اب اپنی انگلی کاٹو۔"

کالے دیو نے اپنی انگلی کاٹی۔ اس میں سے لال لال خون بہنے لگا۔

یوسف نے کہا۔ "دیکھو تمہاری رنگت کالی ہے لیکن خون لال ہے۔ اس کی رنگت سفید ہے لیکن خون اس کا بھی لال ہے۔ چمڑی کی رنگت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

سونے کا دیو اور چاندی کا دیو اور شہزادی کو رلا کر آنسو حاصل کرنیوالا چودھری بچوں کی کہانیوں کے روایتی کردار نہیں ہیں یہاں وہ سرمایہ پرستی سے پیدا ہونیوالی بے حسی اذیت پسندی، بے رحمی اور انسانیت سوز ذہنیت کے ترجمان ہیں۔ سونے کا دیو انسان کے خون سے سونے کی دیوار اگاتا ہے۔ اسے انسان کے خون کا درد نہیں۔ صرف سونے کی دیوار کے اگنے کا احساس ہے۔

یوسف نے گھبرا کر کہا۔ "مگر یہ تو انسانی خون ہے۔!"

دیونے ہنستے ہوئے کہا۔ "مگر یہ بھی تو دیکھو کہ دیوار کتنی اونچی ہو گئی ہے۔"
دولت پرستی کی بے حسی کا اس سے زیادہ چبھتا ہوا اظہار کیا ہو سکتا ہے۔

اسی طرح سونے اور چاندی کے دیوؤں کے جسموں کی بناوٹ، بھڑکے ہوئے تخیل کی پیداوار نہیں ہے۔ دیوؤں کے منھ سے چاندی اور سونے کے سکے گرنا اور پھر طشتری میں کھنک کے نل کے ذریعے پھرا نہیں کی ناف میں چلے جانا اس عمل کی طرف ایک واضح اشارہ ہے جس کے ماتحت سرمایہ داری نظام میں دولت ساری قوم میں نہیں بلکہ قوم کے چند مخصوص افراد کے ہاتھوں میں گھومتی رہتی ہے۔ لیکن مشینوں کے شہر میں تو کرشن چندر کا تخیل سرمایہ دارانہ نظام کے ہولناک انجام کی ایک عبرتناک تصویر کھینچ دیتا ہے۔ نفع خوری اور استحصال اور حد سے زیادہ مشین پرستی انسانیت کے لئے کتنا بڑا خطرہ بن سکتی ہے۔ اس کی ایک مکمل تصویر مشینوں کا شہر پیش کرتا ہے۔ یہ تصویر ہمیں ایچ جی ویلیس کی سائنٹفک فینٹسی Scientific Phantesies کی یاد دلاتی ہے۔ صفر صفر ایک کی انگلیاں اس کے باپ کے ہاتھوں کٹوا کے کرشن چندر نے دہشت پسندی کا ثبوت نہیں دیا۔ انہوں نے اس غلامانہ ذہنیت پر ایک زبردست طنز کیا ہے جو مشینوں کو انسان کے ہاتھوں سے زیادہ اہمیت دیتی ہے اور جسمانی محنت کی عظمت سے اس حد تک انکار کرتی ہے کہ انگلیاں کٹ بیٹھتی ہے۔ ناول کے آخری حصے میں مشقت کرنے کی وجہ سے صفر صفر ایک (جس کا نام موہن ہو گیا ہے۔) کے ہاتھوں پر انگلیاں اُگ آنا محنت کی عظمت پر ہی زور دیتا ہے۔ اس حصے میں یوسف کے آخری الفاظ کرشن چندر کے مخصوص جذباتی انداز فکر ہی کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ ایک ٹھوس حقیقت بیان کرتے ہیں۔

"مگر یہ اتنا بڑا شہر، یہ خوبصورت سڑکیں، کاریں، مکان، گھر، گلی کوچے بازار، دولت کے انبار ــــ ان سب کا کیا ہوگا۔؟
"آدمی کے بغیر ان کی کوئی قیمت نہیں۔ ان تمام چیزوں کی قیمت آدمی سے ہوتی ہے۔

کپڑے آدمیوں کے پہننے کے لئے ہوتے ہیں مٹھائیاں بچوں کے کھانے کے لئے ہوتی ہیں سڑکیں راہگیروں کے گذرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ لیکن اگر کارخانے میں مزدوروں کے ہاتھ کام نہ کرتے ہوں اور گھروں میں عورتوں کی ہنسی نہ سنائی دیتی ہو اور گلی کوچوں میں بچوں کے شور مچانے کی آواز نہ آتی ہو........ کیا تم نے کسی گلی کوچے میں شور مچایا ہے۔؟"

پچھلے کچھ عرصے سے کرشن چندر کے ادب میں دولت پرستی کے خلاف ایک شدید ردِ عمل نظر آ رہا ہے۔ ڈرامہ "ایک روپیہ ایک پھول" کا تو بنیادی موضوع ہی یہ تھا وہ ایک طرف روپیہ رکھتا ہے اور دوسری طرف پھول اور پھر پوچھتا ہے تم کیا چنو گے۔ زندگی کی جذباتی قدروں کو اس نے پھول کا روپ دیا ہے۔ موتی کے آنسو گرانے والی شہزادی کے بیان میں کرشن چندر نے کس خوبصورت اور تیکھے پیرائے میں دولت پرستی پر طنز کیا ہے۔

شہزادی نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ یکایک اس کی آنکھوں سے موتی گرنا بند ہو گئے اور ہونٹوں سے پھول گرنے لگے۔ خریدار گھبرا کر بھاگ گئے کیونکہ وہ موتیوں کے خریدار تھے۔ پھولوں کے خریدار نہیں تھے۔

تھوڑی دیر میں چاروں طرف الو بولنے لگے۔ پھر نیلام کرنے والا چابک مارتے مارتے خود بیہوش ہو کر گر گیا۔ کیونکہ وہ پھولوں کی خوشبو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

جادوگروں کا الیکشن ایک دفعہ پھر روائتی کرداروں کا اجتماع ہے الہ دین چراغ والا، سلیمانی ٹوپی والا، کاغذ پر منتر پھونکنے والا، بچوں اور بڑوں دونوں کے لئے یہ کردار جانے پہچانے ہیں۔ لیکن جس روپ میں ان کو کرشن چندر نے پیش کیا ہے وہ جانا پہچانا اور مانوس روپ نہیں ہے۔ وہ ان کا تمثیلی روپ ہے۔

ان کی تقریروں میں کیا ایک ذہین قاری موجودہ سیاست کے سینے پر طنز کی ننگی تلوار دھری نہیں دیکھتا۔؟ یہ تینوں کردار ایک دوسرے کے کپڑے اتار کے کیا سیاستِ حاضرہ کے رجحانات کو ہمارے سامنے ننگا نہیں کر دیتے۔؟

کہ جادوگروں کا الیکشن ایک سیاسی تمثیل ہے۔ اس کی تصدیق سانپوں کے شہر اور سوتوں کے شہر کے بیان میں ہو جاتی ہے۔ ان دونوں شہروں کے بیان میں کرشن چندر نے حکمران طبقے کی ان چالوں کو بے نقاب کیا ہے جن کے ذریعے وہ رعایا کو دہشت میں اور غفلت میں گرفتار کر کے اپنا مستقبل محفوظ بناتے ہیں۔ سانپوں کا شہر ایک ایسا شہر ہے۔ جہاں کی رعایا میں سرکار نے سانپوں کا ڈر پھیلا کر انہیں بالکل بے حوصلہ ______ Demoralize کر رکھا ہے۔ یہ سانپ سبز قبا والے بوڑھے کے الفاظ میں۔

"بیٹا وہ سانپ نہیں تھے وہ آدمی تھے .... ایسے آدمیوں کے دل میں زہر بھرا ہوتا ہے۔ اور ان کی آنکھوں میں پتلیوں کی بجائے چاندی کی ٹکیاں ہوتی ہیں۔ ...... یہی وہ آدمی ہیں جو آدمیوں کو لوٹتے ہیں اور ان میں جنگیں کراتے ہیں۔

اسی طرح سوتوں کے شہر کی رعایا کو دیوؤں نے "سوتے جاگتے" کے چکر میں پھنسا رکھا ہے اور بقولِ بوڑھے پادری۔

"یہ نہ اتنے سوئے ہوئے ہیں کہ کوئی کام نہ کر سکیں اور نہ اتنا جاگتے ہیں کہ اپنا برا بھلا سوچ سکیں۔"

بوڑھا پادری موہن کو لال کے بدلے بولنے والا شنکھ لانے کے لئے کہتا ہے جسے بجا کے وہ رعایا کو جگا سکے۔ اور دیوؤں کی حکومت ختم کر سکے۔ مگر کرشن چندر کا یہ شنکھ بھی معنویت سے خالی نہیں۔ موہن جب دیوؤں کے قلعے میں پہنچ کے اس شنکھ سے بولنے کے لئے کہتا ہے تو وہ صاف جواب دیتا ہے۔

یوسف۔ "تو چلئے۔ میں آپ کو ہاتھوں میں اٹھائے لیتا ہوں۔ آپ بولنا شروع کیجئے تاکہ دیوؤں کے کان پھٹ جائیں۔"

"اچھا اٹھاؤ مجھے۔"

لیکن جب موہن اسے اٹھانا چاہتا ہے تو وہ زور لگا کے رہ جاتا ہے۔

"آپ تو بہت بھاری ہیں۔!"

"تو میں کیا کروں۔"

"آپ یہیں سے چلانا شروع کر دیجئے۔"

"نہیں۔" شنکھ بولا۔ "جب تک کوئی مجھے اٹھا کر اپنے منھ تک نہ لے جائیگا۔ میں چلا نہیں سکتا۔"

لیکن یہ شنکھ اتنا وزنی کیوں ہے اور اس کا وزن کس طرح کم ہوگا۔ اس کا راز سبز قبا والا بوڑھا ہی جانتا ہے۔ وہ شہزادی کو بتاتا ہے کہ یہ شنکھ اس وقت تک ہلکا نہ ہوگا جب تک اس پر سونے کے قلعے سے لا کے گلاب کا پھول نہ رکھا جائیگا۔ یہ شنکھ کیسا ہے اور یہ گلاب کے پھول سے چھوانے کی بات کیا ہے۔ شروع میں یہ محض سسپنس Suspence پیدا کرنے کی ترکیب معلوم ہوتی ہے لیکن جب گلاب کا پھول رکھتے ہی یہ شنکھ ایک دم ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے اور موہن کے اٹھانے پر تو نہیں لیکن شہزادی کے پھونکنے پر "اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔" گونجنے لگتا ہے تو یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ کرشن چندر ایک گہری اشاریت سے کام لے رہا تھا۔ شنکھ اور گلاب کے پھول کی معرفت وہ اس حقیقت کو پیش کر رہا تھا کہ ادب قوم کی روح میں بیداری اسی وقت پھونک سکتا ہے جب اس میں جمالیاتی وصف Aesthetic quality (گلاب کا پھول جمالیاتی وصف کا رمز ہے) پیدا ہو جائے گا۔ جب تک ادب میں آرٹ نہ سمویا جائے گا۔ وہ شنکھ کی طرح بھاری ثقیل رہے گا۔ یہی نہیں، یہی نہیں، ادب کی آواز میں جب تک انسان کی آواز شامل نہ ہوگی وہ گونگا رہے گا۔

پادری نے شنکھ کو گلے سے لگا لیا اور بولا "میں اب سمجھ گیا۔ اب یہ دیوؤں کا شنکھ نہیں ہے، یہ انسان کا شنکھ ہے۔ یہ خود نہیں بولے گا اس میں انسان کا سانس اور محنت بولے گی۔

گلاب کا پھول لانے کے لئے شہزادی سونے کی جس پہاڑی پر جاتی ہے وہ بھی معنویت اور اشاریت کے اثر سے محفوظ نہیں ہے۔ پہاڑی کا اور قلعہ کا اور جوہری کا اس کی بیٹی اور اس کے ستار کا سونے کا ہو جانا "شہنشاہ میڈاس" کی داستان کا دوسرا روپ نہیں ہے اس میں اخلاقی درس دینے کی بجائے کرشن چندر نے دولت پرستی کے خلاف اپنے جذبۂ تنفر اور اپنے فلسفۂ حیات کے جذباتی کردار کی جھلک پیش کی ہے۔

شہزادی: مگر یہ آدمی تو زندہ ہے۔ اس کا دل حرکت کر رہا ہے۔

ستار: ہاں اس کا سارا جسم سونے کا ہو چکا ہے، مگر دل سونے کا نہیں ہوا ہے اس لئے یہ آدمی ابھی تک زندہ ہے...... ایک دن اس نے غلطی سے بیٹی کو اپنے پارس پتھر سے چھو لیا! اور اس کی بیٹی سونے کی ہو گئی۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ سونے کی بنی ہوئی بیٹی پھر سے گوشت پوست کی لڑکی بن جائے مگر اسے کامیابی نہ ہوئی جب یہ اپنی بیٹی کو زندہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے اپنے آپ کو بھی پارس پتھر سے چھو لیا اور سونا ہو گیا۔ مگر چونکہ اس کے دل میں سونے سے نفرت پیدا ہو چکی تھی اس لئے اس کا دل اندر سے گوشت کا ہے۔

اور

ستار: گانے کے لئے خوبصورت انگلیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کی زندہ انگلیوں کی۔ اور اس زندگی کے لئے سونے کی نہیں صرف سادہ پانی کی ضرورت ہے۔

لیکن یہ معنویت، اشاریت، طز اس ناولٹ کے شنکھ کی طرح بوجھل بن کر رہ جاتا۔ اگر کرشن چندر نے اسے اپنے فن کے پھول سے چھوا کے لطیف نہ بنا دیا ہوتا یہ لطیف پیرایہ ناولٹ کے اختتام پر تو اپنے فنی کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ اس فنطاسیہ کے ریشمی دھاگوں کو کرشن چندر نے کس صناعی سے خیال کی دوڑ کے گرد لپیٹا ہے۔

"مگر بابا میں تو پورے طور پر اس درخت پر چڑھا بھی نہیں۔"

یوسف نے کہا۔ "میں نے تو اس کی چوٹی دیکھی بھی نہیں۔ بابا مجھے اس درخت کی چوٹی دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔"

بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹا یہ کوئی معمولی درخت نہیں ہے۔ یہ انسان کی ترقی کا درخت ہے۔ اس کی چوٹی آج تک کسی نے نہیں دیکھی۔"

اور

"کیوں بابا آپ رکیں گے کیوں نہیں۔ ؟" یوسف نے پوچھا۔

"رک جایئے نا۔ !" شہزادی نے بابا سے لپٹ کے بڑے پیار سے کہا۔

"رک نہیں سکتا بیٹی۔" بابا نے آہستہ سے کہا۔ "میرا کام رکنا نہیں چلنا ہے ہمیشہ چلتا رہتا ہوں۔ ہمیشہ چلتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا نام تاریخ ہے۔"

اس ناولٹ میں کرشن چندر نے خیال کا کانچ اس قدر باریک پیس کے اور کپڑ چھن کر کے مواد میں ملایا ہے کہ کہیں در درا پن محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے لطیف اور نفیس قالب کا کوئی تانا بانا خیال کی کھینچا تانی میں ٹوٹنے نہیں پایا۔ کرشن چندر کی صناعی اور فنی چابکدستی کا "الٹا درخت" ایک نادر نمونہ ہے۔

ریوتی سرن شرما

جب یوسف کا باپ مرا تو یوسف کے پاس ایک جھونپڑا، ایک گائے، ایک کنواں اور ایک باغیچہ باقی رہ گیا تھا۔ باقی سب کچھ جو تھا وہ یوسف کا باپ اپنی زندگی ہی میں قرض کی بھینٹ چڑھا چکا تھا۔ کچھ گاؤں کے خرچے کو کچھ بادشاہ کو۔

باپ کے مرنے کے بعد یوسف کی ماں نے یوسف سے کہا۔

"اب ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔ اب تو سیدھا بادشاہ کے پاس چلا جا اور اس کی فوج میں بھرتی ہو جا۔"

یوسف بڑا بے وقوف اور منہ پھٹ تھا۔ وہ صرف بارہ برس کا تھا اور بات کرنے کی اسے تمیز نہ تھی۔ اس لئے اس نے ماں کی بات نہ مانی۔ الٹا کہنے لگا۔

"واہ میں کیوں بادشاہ کے پاس جاؤں؟ بادشاہ خود کیوں نہ

میرے پاس آئے۔؟ فوج کی ضرورت اُسے ہے، مجھے تو نہیں۔"

ماں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا بولی۔

"شش آہستہ بات کر۔ بادشاہ سن لے گا تو جان سے مار دیگا۔"

ایسا ہی ہوا۔ یہ بات بادشاہ کے کانوں تک پہنچ گئی، کیونکہ جو بادشاہ ظلم کرتا ہے وہ ملک میں مخبر بھی لگائے رکھتا ہے۔ جونہی اسے معلوم ہوا کہ یوسف نے کیا کہا۔ وہ خود یوسف کے پاس پہنچ گیا۔ یوسف نے پہلے اپنے بادشاہ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو۔؟"

بادشاہ نے کہا۔ "میں با۔ با۔ با۔ بادشاہ س۔ س۔ س سلامت ہوں۔"

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے تم تو ہکلے ہو؟ کیا سب بادشاہ ہکلے ہوتے ہیں۔؟"

بادشاہ کو بہت غصہ آیا۔ مگر اس وقت اسے فوجیوں کی ضرورت تھی۔ اس لئے غصہ کو پی گیا۔ بولا۔

"نہیں ک...... ک...... کچھ ہکلے ہوتے ہیں، کچھ گ۔ گ گنجے ہوتے ہیں، کچھ ب۔ ب۔ بہرے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو۔ کو۔ کو۔ کوئی نہ کوئی بیماری ضرور ہوتی ہے۔"

"تمہیں کیا بیماری ہے۔؟" یوسف نے پوچھا۔

"مجھے ظلم کرنے کی بیماری ہے۔" بادشاہ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

مگر میں کہاں تک اس کے ہکلے پن کو بیان کر سکتا ہوں۔ بادشاہ کا ہکلا پن بیان کرتے کرتے میرا قلم خود نہ ہکلا ہو جائے اس لئے اب سیدھے سیدھے لکھتا ہوں۔ تم سب جہاں کہیں بھی بادشاہ کی بات چیت آئے اسے خود ہکلا کے پڑھو۔ بڑا مزا آئے گا۔

یوسف نے کہا۔ "تو کیا مجھ پر بھی ظلم توڑنے آئے ہو۔؟"

بادشاہ نے کہا۔ "نہیں نہیں۔ اپنی فوج میں بھرتی کرنے آیا ہوں۔"

"تنخواہ کیا دو گے۔؟"

بادشاہ نے کہا۔ "میں اپنے فوجیوں کو تنخواہ نہیں دیتا، لوٹ میں سے چوتھا حصہ دیتا ہوں۔"

"لوٹ کیسی۔؟"

"میرے فوجی دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں۔ لوٹ مار کرتے ہیں اور جو مال لاتے ہیں اس میں سے چوتھا حصہ ان کو دیتا ہوں۔ مگر تم کو دسواں حصہ دوں گا۔ کیوں کہ تم ابھی چھوٹے ہو۔ بارہ برس

کے ہو۔ زیادہ لوٹ مار نہ کر سکو گے۔ جلدی بولو۔ تمہیں میری نوکری منظور ہے؟ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

یوسف نے سوچ کر پوچھا۔ "دوسرے ملکوں میں بھی آدمی رہتے ہیں نا۔؟"

"ہاں بالکل تمہاری طرح کے آدمی رہتے ہیں۔"

یوسف نے کہا۔ "تو پھر میں تمہاری نوکری نہیں کر سکتا۔؟"

بادشاہ نے اکڑ کر کہا۔ "جانتے ہو تم بادشاہ سلامت سے بات کر رہے ہو۔؟"

یوسف نے بھی اکڑ کے جواب دیا۔ "جانتے ہو تم ایک موچی کے بیٹے سے بات کر رہے ہو۔"

بادشاہ مسکرا دیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ لڑکا بے وقوف ہے۔ اب اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس نے جھونپڑے کے اردگرد نگاہ ڈالی۔ خوب صورت باغیچے میں کھلے ہوئے حسین پھولوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تمہارے باغیچے کے پھول بہت خوبصورت ہیں۔"

یوسف اس تعریف سے بہت خوش ہوا۔ بولا۔ "جتنے پھول چاہئیں لے جاؤ۔"

بادشاہ نے کہا۔ "جس زمین سے یہ پھول کھلتے ہیں وہ خود کتنی خوب صورت ہوگی۔ میں اس زمین کو کیوں نہ لے لوں۔؟"

یہ کہہ کر بادشاہ نے تالی بجائی۔ پچاس فوجی حاضر ہوگئے اور انہوں نے یوسف کا باغیچہ ضبط کرلیا، بحکم سرکار۔

دوسرے دن ماں نے یوسف سے کہا۔

"اب تو باغیچہ بھی ہاتھ سے گیا۔ اب تو بادشاہ کی پلٹن میں بھرتی ہو جا۔"

یوسف نے کہا: "ماں اگر میں بھرتی ہوگیا تو مجھے ظلم کرنے کی بیماری ہوجائے گی۔ یاں کیا تو چاہتی ہے کہ تیرا بیٹا بیمار ہو جائے۔؟"

ماں نے کانوں پر ہاتھ دھر کر کہا۔ "توبہ توبہ بیٹا۔ میں تو دن رات تیری صحت کی دعائیں مانگتی ہوں۔" اتنا کہہ کر ماں جھونپڑے کے اندر چلی گئی۔ یوسف کنویں سے ڈول کھینچ کر انچی گائے کو پانی پلانے لگا۔ اتنے میں اسے اپنے باغیچے میں، جو اَب بادشاہ کا ہوچکا تھا، ایک خوب صورت کپڑے پہنے ہوئے لڑکی نظر آئی۔

یوسف نے پوچھا "تم کون ہو۔؟"

لڑکی نے کہا: "میں بادشاہ زادی ہوں۔ میں اپنے نئے باغیچے کی سیر کے لئے نکلی ہوں۔ مجھے جھک کر سلام کرو۔"

"کیوں سلام کروں۔؟" یوسف نے پوچھا۔

شہزادی نے اکڑ کر کہا۔ "میں شہزادی ہوں۔"

یوسف نے اکڑ کر کہا۔ "میں موچی کا بیٹا ہوں۔"

شہزادی نے کہا۔ "میرے کپڑے سونے کے تاروں کے بنے ہوئے ہیں۔"

یوسف نے کہا۔ "میرے دانت بہت مضبوط ہیں۔"

شہزادی بولی: "میں ہر روز گاجر کا حلوا کھاتی ہوں۔"

یوسف بولا۔ "میں گاجر اُگاتا ہوں۔ کیا تم گاجر اُگا سکتی ہو؟"

شہزادی بولی۔ "نہیں۔"

یوسف تلخی سے کہنے لگا۔ "تم صرف حلوا کھا سکتی ہو۔ خیر کہو کیا کام ہے، کیوں آئی ہو۔؟"

شہزادی بولی۔ "مجھے پیاس لگی ہے۔"

یوسف نے کنوئیں سے ڈول کھینچا اور شہزادی کو پانی پلایا۔

شہزادی نے پانی پی کر کہا۔ "تمہارے کنوئیں کا پانی تو بہت میٹھا ہے۔ ایسا پانی تو میں نے زندگی میں کبھی نہیں پیا۔"

یوسف نے خوش ہو کر کہا۔ روز یہاں آجایا کرو تو میں تمہیں روز اسی کنوئیں کا پانی پلا دیا کروں گا۔"

"اگر یہ پانی میٹھا ہے تو یہ کنواں کتنا میٹھا ہوگا جس سے یہ پانی نکلتا ہے۔

میں اس کنوئیں ہی کو کیوں نہ لے لوں۔؟"

شہزادی نے تالی بجائی۔ پچاس فوجی حاضر ہو گئے اور انہوں نے کنوئیں کو ضبط کر لیا۔ بحکم سرکار۔

تیسرے دن ماں نے پھر یوسف سے کہا۔ "بیٹا اب تو فوج میں بھرتی ہو جاؤ ورنہ ہم بھوکے مر جائیں گے۔"

یوسف نے کہا۔ "ماں ابھی تو یہ گائے باقی ہے۔ میں گاؤں کے خوجے کے پاس بیچ کر آتا ہوں۔ جو رقم ملے گی اس سے کچھ دن روٹی کھا لیں گے۔ پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔"

ماں رونے لگی۔ گائے اسے بہت پیاری تھی مگر بھوک کا کیا علاج۔ یوسف گائے کو کھول کر گاؤں کے خوجے کے پاس لے گیا۔

خوجے نے پوچھا۔ "گائے کتنا دودھ دیتی ہے۔؟"

"تین سیر دیتی ہے۔ اچھا دودھ ہوتا ہے۔ پی کر دیکھ لو۔"

"پی چکا ہوں۔ جب تمہارا باپ زندہ تھا تب کی بات ہے۔ گائے بہت اچھی ہے مگر دودھ کم دیتی ہے۔ تین سیر دودھ دیتی ہے اس لئے اس گائے کے تمہیں تین روپے ملیں گے۔"

"صرف تین روپے۔؟" یوسف نے حیران ہو کے پوچھا

"ہاں" خوجے نے کہا۔ "ایک سیر دودھ کا ایک روپیہ ہوتا ہے

اس حساب سے تین سیر کے تین روپے ہوئے۔ اگر تمہاری گائے چالیس سیر دودھ دیتی تو تم کو چالیس روپے ملتے۔ مگر میں کیا کروں تمہاری گائے تین ہی سیر دودھ دیتی ہے۔ یہ تین روپے لے جاؤ، حساب بالکل ٹھیک ہے۔"

یوسف بیچارے کو حساب کہاں آتا تھا۔ بولا۔ "چاچا اس سے تو میرے گھر کا کام نہیں چلے گا۔"

خوجے نے کہا "تو یہ تین دانے لے جاؤ۔"

"یہ تین دانے کیسے ہیں۔؟"

"جادو کے ہیں۔ ایک جادوگر کو میرا قرضہ دینا تھا، وہ دے گیا تھا ... ان تین دانوں کو جو کوئی زمین میں بوئے گا۔ اس کی زمین میں دوسرے ہی دن ایک جادو کا پیڑ نکلے گا جو آسمان کی طرف بلند اور بلند ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ بالکل آسمان تک پہنچ جائے گا پھر تم اس درخت پر چڑھ کے آسمان تک جا سکتے ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ ان تینوں جادو کے دانوں کو اکٹھا بو دو"

..یوسف حیرت سے خوجے کی باتیں سنتا رہا۔ آخر میں خوجے نے کہا، "تو بولو کیا لیتے ہو۔ یہ تین روپے یا یہ تین دانے۔؟"

.یوسف نے جلدی سے تین دانوں کو اپنی مٹھی میں دبایا۔ اور

اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ خوجہ بھاگتے ہوئے یوسف کو دیکھ کر
مسکرایا۔ بولا۔ "خوب اُلّو بنایا، گدھے کو۔"

یوسف بھاگتے ہوئے گھر۔۔۔ پہنچا تو ماں نے کہا۔
روپے لائے۔؟

یوسف نے کہا۔ "میں تو جادو کے دانے لایا ہوں۔"

ماں نے ماتھا پیٹ لیا۔ بولی "ساری عمر بچّے ہی رہو گے۔ یا
کبھی عقل کی بات بھی کرو گے۔؟ ارے ان دانوں کا کیا ہو گا۔؟
روپے لائے ہوتے تو کچھ دو چار روز روٹی تو کھاتے۔ کیسا بیوقوف
ہے میرا بیٹا۔"

یوسف نے کہا۔ "یہ تین دانے جادو کے ہیں۔ انہیں باہر
باغیچے میں بوؤں گا۔ تو ان میں سے ایک جادو کا پیڑ نکلے گا جو آسمان
تک جائے گا۔ پھر اس پیڑ پر چڑھ کر آسمان تک جاؤں گا۔"

ماں نے کہا۔ "آسمان پر جاکے کیا کرو گے۔؟"

بیٹے نے کہا۔ "تمہارے لئے آسمان کے تارے توڑ کر لاؤں گا۔"

ماں نے سر ہلا کر کہا۔ "کیسے کیسے سپنے دیکھتا ہے میرا بیٹا۔ اس
کو خوجے نے ٹھگ لیا۔ جاتی ہوں پڑوسی کے گھر سے کچھ مانگ
کر لاتی ہوں۔"

جب ماں چلی گئی تو یوسف نے مٹھی کھولی اور دانوں کو باہر
باغیچے کی گھاس پر رکھ کر ایک جگہ زمین کھودنے لگا تاکہ ان دانوں
کو بودے۔ اتنے میں ایک کوّا کائیں کائیں کرتا ہوا آیا اور دو دانے
اٹھا کے لے گیا۔ یوسف بہت پریشان ہوا کیونکہ خوجے نے کہا
تھا کہ تینوں دانے اکٹھے بونا ورنہ جادو کا اثر نہیں ہوگا۔ یوسف
غم کے مارے رونے لگا۔ گائے بھی گئی، روپے بھی گئے اور آخر میں
جادو کے دانے بھی گئے۔ اب اس کے پاس صرف ایک دانہ رہ گیا
تھا۔ اب وہ کیا کرے۔؟ آخر اس نے سوچا، جو ہو گا دیکھا جائیگا۔
جادو کا پیڑ نہ سہی، کوئی پودا تو اُگے گا۔ یہ سوچ کر اس نے اس
دانے کو باغیچے کی نرم بھربھری زمین میں بو دیا۔ اور جھونپڑے
میں جاکے آرام سے سو گیا۔

رات کو بادل بہت زور سے گرجا اور بجلی بھی لہرا لہرا کر کوندتی
رہی۔ بارش طوفان اور ہوا کے جھکڑ نے رات بھر یوسف کو سونے
نہ دیا۔ رات کو کئی بار اٹھ کے بجلی کی روشنی میں باغیچے کی طرف دیکھا۔
مگر اسے کہیں جادو کا پیڑ نظر نہ آیا۔ جب صبح ہوئی اور طوفان تھما
تو یوسف بھاگ کر باغیچے میں گیا۔ طوفان نے باغیچے کے بہت سے
پودے اکھاڑ مارے تھے۔ بہت سے پیڑ گر گئے تھے اور جہاں اس نے

جادو کا دانہ بویا تھا۔ وہاں زمین بجلی گرنے سے پھٹ گئی تھی اور زمین میں ایک گہرا گڑھا نظر آ رہا تھا۔ مگر جادو کا درخت جو آسمان کی طرف اونچا جاتا تھا۔ وہاں کہیں نہیں تھا۔ یوسف بہت مایوس ہوا۔ اس کی ماں بھی رونے لگی۔ اتنے میں یوسف نے جو غور سے زمین کے اندر گڑھے کی طرف دیکھا تو نظر آیا کہ اس کے اندر ایک بہت بڑا پیڑ اُگا ہے۔ مگر الٹا اگا ہے۔ یعنی یہ درخت آسمان کی طرف جانے کی بجائے نیچے زمین کے اندر ہی اندر، جہاں تک یوسف کی نظر گئی چلا گیا تھا۔ کئی میل نیچے جا کے یہ درخت اندھیرے میں گم ہو جاتا تھا۔

ماں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "افسوس درخت الٹا اُگ آیا جانا تھا۔ اُوپر آسمان کو، چلا گیا نیچے زمین کے اندر۔ یہ سب اس کھوجے کی کارستانی ہے۔"

یوسف زمین کے شگاف میں اتر گیا۔ اس نے درخت کے تنے کے گرد اپنی باہیں لپیٹ لیں۔ اور ماں سے کہنے لگا۔ "درخت الٹا اگا ہے یا سیدھا ہے تو اب اس درخت پر چڑھ کے دیکھتا ہوں کہ یہ کہاں جاتا ہے۔؟"

ماں منت کرتے ہوئے بولی۔ "ارے بیٹا زمین کے اندر مت

جاؤ۔ اندر بہت اندھیرا ہے۔ جانے کیا ہے۔ کیا نہیں ہے۔ مجھے تو آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔"

مگر یوسف نے اس کی ایک بات نہ سُنی۔ وہ جلدی سے درخت کے تنے پر چڑھتا ہوا زمین میں اتر گیا۔ کچھ دُور تو سورج کی روشنی اس کے ساتھ رہی اور وہ اس کی مدد سے درخت کی ٹہنیوں پر چڑھتا رہا، مگر آگے جا کے روشنی کا آنا بند ہو گیا۔ اور وہ تاریکی میں درخت کی شاخوں کو ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے لگا۔

٭

کچھ دور آگے جا کر اتنا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا کہ اسے بالکل کچھ نظر نہ آیا۔ یہاں پر اس کے کانوں میں طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں۔ "مارو۔ مارو، جانے نہ پائے" "بغاوت کر دو۔ آگ لگا دو۔ لیڈروں کو لوٹ لو۔"

جاؤ۔ اندر بہت اندھیرا ہے۔ جانے کیا ہے۔ کیا نہیں ہے۔
مجھے تو آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔"

مگر یوسف نے اس کی ایک بات نہ سنی۔ وہ جلدی سے درخت
کے تنے پر چڑھتا ہوا زمین میں اتر گیا۔ کچھ دُور تو سورج کی روشنی
اس کے ساتھ رہی اور وہ اس کی مدد سے درخت کی ٹہنیوں پر
چڑھتا رہا، مگر آگے جاکے روشنی کا آنا بند ہوگیا۔ اور وہ تاریکی
میں درخت کی شاخوں کو ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے لگا۔

❁

کچھ دور آگے جاکر اتنا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا کہ اسے بالکل
کچھ نظر نہ آیا۔ یہاں پر اس کے کانوں میں طرح طرح کی آوازیں آنے
لگیں۔ "مارو۔ مارو، جانے نہ پائے" "بغاوت کردو۔ آگ لگا دو۔
لیٹروں کو لوٹ لو۔"

یوسف بہت گھبرا گیا۔ اس نے ہاتھ سے ٹٹولا اسے درخت
کے پاس ایک سیڑھی ملی۔ یوسف نے درخت چھوڑ دیا اور سیڑھی پر
چڑھنے لگا۔ سیڑھی پر چڑھ کر وہ ایک دروازے پر پہنچا۔ دروازے
پر دستک دی۔ دروازہ کھل گیا اور اس نے دیکھا کہ وہ ایک بہت
بڑے گنبد کے نیچے کھڑا ہے۔ چاروں طرف لوہے کی سلاخیں ہیں۔
اور ایک طاقچہ میں ایک موم بتی جل رہی ہے۔ گنبد میں کوئی نہیں
ہے۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہزاروں آوازیں ایک دوسرے
سے لڑ رہی ہیں۔

"کون ہے۔" یوسف گنبد کے نیچے کھڑا ہو کے چلّایا۔

'کون ہے، کون ہے۔؟'

یوسف کی آواز گنبد ہی میں گونجی اور پھر جواب میں ہزاروں
قہقہے سنائی دیئے۔ یوسف کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ مگر وہ
ہمت ہارنے والا نہ تھا۔ اس نے چلّا کر کہا "جو ہنستا ہے وہ سامنے
آجائے۔"

جواب میں پھر زور سے قہقہے لگے اور نعروں کی اونچی اونچی آوازیں
سنائی دیں۔ جیسے ہزاروں لاکھوں جلوس ایک ساتھ چل رہے ہوں۔
ابھی یہ آوازیں اس کے کان میں آ ہی رہی تھیں کہ اس کے بالکل قریب

ہی سے گویا ایک آواز سرگوشی میں آئی۔ اس آواز نے کہا۔

"جانتے ہو تم کہاں ہو۔؟"

"نہیں۔" یوسف نے سر ہلا کر کہا۔

"یہ آوازوں کا قبرستان ہے۔"

"آوازوں کا۔؟"

"ہاں" ننھی منی سرگوشی کرنیوالی آواز نے کہا۔ "یہ سب آوازیں ان آدمیوں، شاعروں، سیاست دانوں کی ہیں جن کو ہمارے بادشاہ نے یا تو قتل کرا دیا ہے یا جیل میں ڈال دیا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔"

"پھر۔؟" یوسف نے پوچھا۔ "پھر یہ ہوا کہ قتل کرنے کے بعد بھی اور جیل میں ڈال دینے کے بعد بھی ان شاعروں اور ادیبوں اور سیاست دانوں کی آواز نہیں رکی اور ملک میں گونجتی رہی اس لئے بادشاہ نے ہم تمام آوازوں کو بھی پکڑ لیا ہے۔ اور اس گنبد میں بند کر دیا ہے۔ اب اس کا خیال ہے کہ یہ آوازیں ہمیشہ کے لئے دبا دی گئی ہیں اور اب اس کو ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا بادشاہ کس قدر بے وقوف ہے۔"

یوسف نے پوچھا۔ "کیوں۔؟"

"کیوں کہ ہم تمام آوازوں نے مل کر اس گنبد کے اندر ایک سرنگ تیار کی ہے۔ تم جانتے ہو یہ سرنگ بادشاہ کے محل تک جاتی ہے۔ یہ گنبد، یہ آوازوں کا قبرستان، بالکل بادشاہ کے محل کے نیچے واقع ہے۔ اب ہم سب آوازیں مل کر اس سرنگ میں ایک فتیلے (فلیتہ) کی طرح گھس جائینگی۔ اور تمہارا کام یہ ہوگا کہ اس موم بتی سے اس فتیلے کو آگ لگا دو۔ کیونکہ ہم صرف آوازیں ہی ہیں، ہمارے ہاتھ نہیں ہیں۔ اور جب تک انسان کے ہاتھ اس کام میں نہیں لگیں گے یہ فتیلہ نہیں جلے گا۔ تو اب جلدی سے تم یہ کام کر ڈالو اور پھر بھاگ کر اپنے درخت پر چڑھ جانا اور وہاں سے سب تماشہ دیکھنا۔"

یوسف نے طاقچے سے موم بتی اٹھا کر سرنگ میں رکھ دی۔ گنبد میں لاکھوں آوازیں گرجنے لگیں اور بارود کی تیزی سے سرنگ کے اندر گھستی چلی گئیں۔ یوسف بھاگ کر دروازے سے باہر نکل گیا اور جلدی سے درخت پر چڑھ گیا۔ ابھی درخت کی ایک ٹہنی پر چڑھا ہی تھا کہ ایک زور کے دھماکے کی آواز آئی، جیسے آوازوں کا گنبد پھٹ گیا ہو۔ اور پھر اس نے دیکھا کہ درخت سے دور تک اور بہت دور تک ہزاروں موم بتیاں جلی رہی ہیں اور بہت دور تک اس کا راستہ روشن ہو گیا ہے۔

یوسف خوشی خوشی درخت کے اوپر چڑھتا گیا۔ تین دن اور تین رات

درخت کے اوپر چڑھتا گیا۔ راستے میں اگر اسے بھوک لگتی تو پیڑ سے جادو کے دانے توڑ کر کھاتا جن کا ذائقہ انگور کی طرح میٹھا تھا۔ اور انگور ہی کی طرح ان میں رس بھی تھا۔ جادو کے تھے نا وہ، اسی لئے۔

خیر تین دن اور تین راتیں اوپر چڑھنے کے بعد پھر اندھیرا چھا گیا موم بتیاں ختم ہو گئیں۔ اب پھر وہ تاریکی میں اوپر چڑھتا گیا مگر تاریکی بڑھتی گئی۔ اس نے سوچا وہ کیا کرے، آگے بڑھے یا پیچھے لوٹ جائے ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے ایک جھٹکے سے اسے درخت سے اتار لیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے ہوا میں اڑ رہا ہے۔ یوسف نے اس کے پنجے سے نکلنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ تھوڑی دور اس طرح ہوا میں اڑنے کے بعد کسی نے اسے ایک بہت بلند اور بڑے دروازے پر اتار دیا۔ یہ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ ایک دیو بھی اس کے نیچے سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ یوسف تو خیر آدمی تھا، بڑی آسانی سے اندر چلا گیا۔ دروازہ کی محراب پر لکھا تھا۔

"کالے دیو کا شہر"

یوسف ابھی محراب پر لکھے ہوئے حروف پڑھ ہی پایا تھا کہ کسی نے اسے اپنی مٹھی میں پھر اٹھا لیا اور یوسف نے دیکھا ایک بہت بڑا کالا ہاتھ ہے۔ ایک بہت بڑی کالی چھاتی ہے۔ ایک بہت بڑا کالا چہرہ ہے جس کے اندر بڑی بڑی روشن اور کالی آنکھیں ہیں ——— آخر ان بڑے بڑے کالے ہونٹوں میں سے ایک گرجدار آواز نکلی اور اس نے پوچھا۔

"تو کون ہے۔؟"

یوسف نے پوچھا۔ "تو کون ہے۔؟"

"میں کالا دیو ہوں۔"

یوسف نے کہا۔ "میں ایک موچی کا لڑکا ہوں۔ زمین سے آیا ہوں۔"

"مگر تیرا رنگ کیسا ہے، نہ کالا ہے نہ سفید۔؟"

یوسف نے کہا۔ "ہمارے ہاں اسے گندمی رنگ کہتے ہیں۔"

"افسوس" کالے دیو نے کہا۔ "تو میرے کسی کام کا نہیں۔ میں تجھے آزاد کرتا ہوں۔ جدھر سے آیا ہے ادھر چلا جا۔"

یوسف کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ دیو کیا کہہ رہا ہے۔ مگر وہ اپنی جان بچ جانے پر بڑا خوش تھا۔ اس لئے جلدی جلدی وہاں سے بھاگا۔ راستے میں یوسف نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے شہر میں سے گذر رہا ہے جہاں کے سب امیر لوگ کالے ہیں اور سب غریب لوگ سفید ہیں کالے لوگ سفید لوگوں سے غلاموں کا سا کام لیتے ہیں اور انہیں بڑی گندی جھونپڑیوں میں رکھتے ہیں۔ انہیں ہتھکڑیاں پہناتے ہیں۔ انہیں چابک لگاتے ہیں۔ ان سے مزدوری کراتے ہیں۔ سب محنت کا کام سفید لوگ کرتے ہیں ——— اور کالے آدمی ان کی محنت پر عیش کی زندگی گذارتے ہیں۔ یوسف نے چار راتیں اور چار دن اس شہر میں بسر کئے اور ہر جگہ یہی منظر دیکھا۔ اسے بڑا تعجب ہوا۔ اس لئے جانے سے پہلے وہ پھر کالے دیو کے پاس گیا۔ اور اس سے پوچھا۔ "اماں کالے دیو بھلا یہ کیا ماجرا ہے۔؟ ہر جگہ سفید لوگ غلام ہیں اور کالے لوگ ان پر حکومت کرتے ہیں۔"

کالا دیو ہنسا، بولا۔ "جب میں نے سنا کہ تمہاری زمین پر سفید لوگ کالے لوگوں پر حکومت کرتے ہیں تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ اس لئے ہم نے اپنی حکومت میں سفید لوگوں کو اپنا غلام بنایا ہے اور کالے لوگوں کو ان پر حکومت کرنے دیتا ہوں۔ میں نے تمہاری زمین سے

پکڑ پکڑ کر سفید لوگ یہاں بلوائے ہیں اور ان کو ہتھکڑیوں میں جکڑ رکھا ہے۔"

"یہ بہت بری بات ہے۔" یوسف نے کہا۔

"کیسے۔؟" دیو نے پوچھا۔

یوسف نے کہا۔ "ایک سفید آدمی کو میرے سامنے لاؤ۔"

ایک سفید غلام یوسف کے سامنے لایا گیا۔

یوسف نے کہا۔ "اس کی انگلی کاٹو۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ بڑی خوشی سے۔" دیو نے سفید آدمی کی انگلی کاٹ دی۔ اس میں سے لال لال خون بہنے لگا۔

یوسف نے کالے دیو سے کہا۔ "اب اپنی انگلی کاٹو۔"

کالے دیو نے اپنی انگلی کاٹی۔ اس میں سے بھی لال لال خون بہنے لگا

یوسف نے کہا۔ "دیکھو تمہاری رنگت کالی ہے۔ لیکن خون لال ہے۔ اس کی رنگت سفید ہے لیکن خون اس کا بھی لال ہے۔ چمڑی کی رنگت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"پھر کیا ہونا چاہئے۔" دیو شش و پنج میں پڑ گیا۔

یوسف نے کہا۔ "ہونا یہ چاہیئے کہ نہ کالا سفید پر حکومت کرے اور نہ سفید کالے پر۔ دونوں مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے

کے فائدے میں شریک ہوں۔ میری عقل تو یہی کہتی ہے۔"

دیو نے سر ہلا کر کہا۔ "تمہاری عقل ٹھیک ہے۔ آج سے میں اپنے سفید غلاموں کو آزاد کرتا ہوں۔ آج سے میرے شہر میں کالے اور سفید سب مل جل کر رہیں گے اور اکٹھے محنت کریں گے۔ تم بھی یہیں رہ جاؤ۔ میں تمہیں اپنے شہر کا سردار بناؤں گا۔"

یوسف نے کہا۔ "نہیں، مجھے تو ابھی اس درخت پر چڑھنا ہے جہاں سے تم نے مجھے اتارا تھا۔ اب اگر تم میرے حال پر مہربانی کرنا چاہتے ہو تو مجھے پھر اسی درخت پر پہنچا دو۔"

دیو نے یوسف کی بہت منت وسماجت کی مگر یوسف نہ مانا۔ آخر کالے دیو نے اسے اپنے ہاتھ پر اٹھالیا اور لے کے واپس درخت کی شاخ پر رکھ دیا۔

یوسف درخت پر چڑھنے لگا۔ اب اس نے دیکھا کہ بہت دور تک اندھیرا چھٹ گیا ہے اور بہت دور تک درخت کی شاخوں پر لاکھوں جگنو اوپر ہی اوپر زمین کے سینے کی طرف چمکتے چلے گئے،

ان جگنوؤں کی مدد سے یوسف بہت دور تک درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ لیکن ایک جگہ آ کے جگنوؤں کی روشنی ختم ہو گئی۔ اور اب کے جو اندھیرا شروع ہوا تو یوسف گھبرا ہی گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سات دن اور سات راتوں سے اسی درخت پر چڑھ رہا ہے لیکن درخت ختم ہونے میں نہیں آتا۔ یوسف گھبرا کے درخت سے واپس لوٹنے ہی والا تھا کہ اسے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دو آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ یوسف ان آنکھوں کے قریب گیا تو دیکھا کہ درخت کی ایک بڑی ڈالی پر ایک عجیب قسم کا جانور بیٹھا ہے جس کا چہرہ الو کا سا ہے لیکن باقی سب جسم آدمی کا ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں سے ایک خوفناک چمک نکل رہی ہے۔

یوسف نے حیران ہو کر اس سے پوچھا۔ "تم آدمی ہو کہ الو؟"

"میں ہندوستانی فلموں کا ڈائرکٹر ہوں۔" اس عجیب مخلوق نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کے کہا۔ "میں دن کو سوتا ہوں اور رات کو جاگتا ہوں۔"

یوسف کے گاؤں میں ایک دفعہ چلتا پھرتا سینما آیا تھا۔ اس لئے اسے اس عجیب مخلوق کی بات سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

یوسف نے کہا۔ "مگر تم یہاں اکیلے اس درخت پر بیٹھے کیا کر رہے ہو۔؟"

"میں اکیلا نہیں ہوں۔" فلم ڈائرکٹر نے جواب دیا۔ "ذرا اس ڈال پر آگے بڑھ کر دیکھو، میرے دوسرے بھائی بند بھی جادو کے زور سے اُلّو بنے ہوئے یہیں بیٹھے ہیں ______ گھپ اندھیرے میں۔"

اور واقعی جب یوسف آگے بڑھا تو اسے ڈال پر سینکڑوں اُلّو نما جانور نظر آئے، جو چپ چاپ ڈال پر ٹانگیں لٹکائے اور سر جھکائے اونگھ رہے تھے۔

یوسف کو ان بے چاروں پر بڑا رحم آیا اور بولا۔ "تمہاری حالت ایسی کس نے کر دی۔؟"

وہی پہلا فلم ڈائرکٹر بولا۔ "دس سال کے ایک بچے کے جادو کے زور سے۔"

"وہ بچہ کہتا تھا کہ ہم لوگوں نے پچھلے پچیس برس میں ایک بھی ایسی فلم نہیں بنائی جو بچوں کے لئے ہو۔ اس لئے ہمیں یہ سزا دی جاتی ہے

"وہ بچہ کہاں ہے۔؟"

فلم ڈائرکٹر نے کہا۔ "اسی ڈال پر سیدھے تقریباً تین سو گز تک چلے جاؤ، آگے تمہیں روشنی نظر آئے گی۔ وہاں ایک بہت بڑا کیمرہ دکھائی دیگا وہ کیمرہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے شٹر میں سے ایک آدمی گذر سکتا ہے۔ تم وہاں جا کے، کیمرے کا بٹن دبا کے تین دفعہ کہنا، کٹ کٹ کٹ۔ پھر کیمرے کا شٹر خود بخود کھل جائیگا اور تم اس کے اندر چلے جانا۔ آگے جا کے وہ بچہ تم کو خود مل جائے گا۔"

یوسف نے کہا۔ "مگر اس بچے کی کوئی نشانی تو بتاؤ۔"

فلم ڈائرکٹر نے کہا۔ "اس بچے کے دونوں ہاتھوں میں صرف ایک ایک انگوٹھا ہے۔ باقی سب انگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔"

"ایسا کیوں ہے۔؟" یوسف نے پوچھا۔

فلم ڈائرکٹر نے جواب دیا۔ "ہمیں کیا معلوم۔ ہم فلم ڈائرکٹر ہیں۔ جوتشی نہیں ہیں۔"

یوسف ڈال پر آگے بڑھ گیا۔ ڈال کی آخری ٹہنی کا آخری پتہ ایک بہت بڑے کیمرے کو چھو رہا تھا۔ یہاں مدھم مدھم روشنی بھی تھی۔ یوسف نے کیمرے کا بٹن دبایا۔ کیمرے کا شیشہ، دروازہ

کی طرح کھل کر الگ ہو گیا۔ تھوڑی دور تک وہ اندھیرے میں چلتا رہا پھر یکایک کہیں پر ایک کھٹ کا سا ہوا اور چاروں طرف روشنی ہی روشنی ہو گئی۔ اور اس نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے شہر کے دروازے پر کھڑا ہے۔

مشینوں کا شہر

جہاں تک نظر جا رہی تھی۔ یوسف کو جگہ جگہ اونچی اونچی چمنیوں سے دھواں نکلتا دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی بڑی اونچی عمارتیں تھیں۔ شہر بڑا خوب صورت اور صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ یوسف اسے دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اس نے سوچا چلو کچھ روز اسی شہر کی سیر کریں گے۔ یہ سوچ کر اس نے دروازے کے اندر قدم رکھا اس کے کانوں میں ایک آواز آئی۔ "جیب سنبھال کر چلیے جیب کتروں سے ہوشیار رہیے۔"

یوسف نے ادھر اُدھر دیکھا۔ مگر اسے کہیں کوئی آدمی دکھائی نہ دیا جو یہ آواز دے سکتا۔ یوسف دروازے سے نکل کر آگے سڑک پر چلا گیا۔ یکایک پھر ایک آواز آئی۔ "فٹ پاتھ پر چلیے سرکار۔"

یوسف گھبرا کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ سڑک پر موٹریں گذر رہی تھیں۔ بڑی خوب صورت موٹریں تھیں۔ آگے چوک پر جا کے یہ سب

موٹریں رک گئیں۔ ایک لال رنگ کی بتی کے سامنے یہ موٹریں رکی پڑی تھیں۔ یوسف نے سب سے آگے کی موٹر میں جھانک کر دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، کیونکہ موٹر میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ جونہی یوسف نے موٹر میں جھانکا، موٹر کے اندر سے آواز آئی: "آئیے تشریف لائیے۔" پھر موٹر کا دروازہ آپ ہی کھل گیا۔

یوسف اسپرنگ دار گدوں کی سیٹ پر ڈٹ کر بیٹھ گیا۔ موٹر میں سے پھر آواز آئی۔ "کہاں چلئے گا حضور؟"

یوسف نے کہا۔ "بازار لے چلو۔"

اتنے میں ہری بتی جلی۔ موٹر خود بخود روانہ ہو گئی۔ اب موٹر بازاروں میں سے گذر رہی تھی۔ بازار میں ہر دکان کھلی پڑی تھی اور ہزاروں طرح کی چیزیں دوکانوں پر نظر آ رہی تھیں۔ خوب صورت کپڑے طرح طرح کے پھل اور کیک بسکٹ اور رنگارنگ کی مہکتی ہوئی مٹھائیاں۔ ہر چیز سجی ہوئی تھی۔ مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ سارے بازار میں کہیں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ ایک پیٹرول پمپ کے پاس جا کے موٹر خود بخود رک گئی۔ آواز آئی: "معاف کیجئے۔ پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔ میں ذرا تھوڑا پیٹرول لے لوں، آپ جب تک سامنے کی

دوکان دیکھئے۔"

دوکان دیکھنے سے پہلے یوسف پیٹرول پمپ دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ پیٹرول کا نل خود بخود اٹھا اور موٹر میں پیٹرول ڈالنے لگا۔ اور جب پیٹرول ڈال چکا تو پھر خود بخود اپنی جگہ پر آکے رک گیا۔ یوسف گھوم کے دوکان کی طرف مڑ گیا۔ یہاں بڑی اچھی اچھی مٹھائیاں، تھالوں میں سجی ہوئی رکھی تھیں۔ مگر نہ کوئی دوکاندار تھا نہ گاہک تھا۔ یوسف نے دو گلاب جامن اٹھائیں۔ دو رس گلے کھائے۔ ایک امرتی کھائی اور رومال سے منہ صاف کیا اور واپس چلنے کو تھا کہ کسی نے کہا۔ "جناب آٹھ آنے تو دیتے جائیں۔"

یوسف حیران ہو کر پیچھے مڑا مگر دوکان پر کوئی آدمی نہ تھا۔ یوسف کو بڑی حیرت ہوئی۔ مگر اس نے اپنی حیرت کو دباتے ہوئے کہا۔

"میری جیب میں اس وقت تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

آواز آئی۔ "کوئی بات نہیں آپ کے حساب میں لکھ لیا جائیگا۔"

اتنے میں ایک کھٹکا ہوا اور یوسف نے دیکھا کہ دوکان پر جہاں دوکاندار بیٹھتا ہے۔ وہاں ایک مشین بیٹھی ہے۔ یوسف کے جواب دیتے ہی اس مشین میں ایک بتی جلی۔ کھٹاک کھٹاک کی آواز دو دفعہ آئی اور مشین سے ایک لوہے کا کمانی دار ہاتھ نکلا اس ہاتھ میں ایک

چینی کی پلیٹ رکھی تھی۔ اور اس پلیٹ پر کاغذ کے ایک پرزے پر ایک بل چھپا تھا، جس پر آٹھ آنے کی رقم درج تھی۔

آواز آئی۔ "اسے اپنی جیب میں رکھ لیجئے، شہر سے واپس جاتے وقت آپ سے حساب کر لیا جائے گا۔"

یوسف نے حیران ہو کر پرچہ لیا اور موٹر میں بیٹھ گیا۔

موٹر نے کہا۔ "کہاں چلوں۔؟"

یوسف نے کہا۔ "تھک گیا ہوں کسی ایسی جگہ لے چلو جہاں آرام کر سکوں۔"

موٹر ایک عالی شان ہوٹل کے دروازے پر رک گئی۔ خود بخود موٹر کا پٹ کھلا۔ خود بخود ہوٹل کا دروازہ کھلا۔ یوسف اندر چلا گیا۔ اب تھوڑی تھوڑی بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک طرف ایک بڑی سی مشین پڑی تھی جو اس کے آتے ہی رنگا رنگ کی روشنیوں سے چمکنے لگی۔ یوسف اس مشین کے پاس چلا گیا اور بولا۔ "مجھے ایک کمرہ چاہیئے۔"

مشین نے کہا۔ "تمہارا نام۔؟"

"یوسف۔"

"کہاں سے آئے ہو۔؟"

"بادشاہ کی نگری سے ۔"

"کیسے آئے ہو ۔ ؟"

"جادو کے درخت پر چڑھ کے ۔"

"یہاں کتنے دن رہو گے ۔ ؟"

"جتنے دن کسی انسان کی صورت نظر نہ آئے گی ۔"

مشین ہنسی ۔ یوسف بھی ہنسا ۔ مشین نے کہا ۔ "یہ سامنے کا کمرہ ہے ۔ اس کو لفٹ کہتے ہیں ۔ اس کے اندر جا کے کھڑے ہو جاؤ ۔ یہ لفٹ تم کو تمہارے کمرے کے سامنے پہنچا دے گی ۔"

یوسف نے ایسا ہی کیا ۔ لفٹ نے اس کو ایک بہت بڑے کمرے کے سامنے اتار دیا ۔ یوسف جب دروازے کے قریب پہنچا تو دروازہ آپ ہی آپ کھل گیا ۔ اندر جا کے کیا دیکھتا ہے کہ ایک کمرہ ہے بہت بڑا ۔ وہ سارا کا سارا طرح طرح کی مشینوں سے بھرا پڑا ہے ۔ ایک کونے میں ایک کرسی رکھی ہے ۔ اور اس پہ ایک چھوٹا سا لڑکا بیٹھا ہے ۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک اور کشش ہے ۔ اور اس لڑکے کے ہاتھوں پہ انگلیاں نہیں ہیں ۔ صرف انگوٹھے باقی رہ گئے ہیں ۔

یوسف نے کہا ۔ "السلام علیکم ۔"

لڑکے نے کہا ۔ "ہیلو ۔"

یوسف نے پوچھا ۔ "تمہاری انگلیاں کہاں ہیں ۔ ؟"

لڑکے نے کہا ۔ "انگلیوں کی ضرورت ہی کیا ہے ۔ یہاں سب کام بٹن دبانے سے ہو جاتا ہے ۔ اس کے لئے انگوٹھا کافی ہے ۔"

یوسف نے پوچھا ۔ "تمہارے اس شہر کے لوگ کہاں رہتے ہیں ۔ ؟ میں نے بازاروں میں، سڑکوں پر سب جگہ گھوم کے دیکھا ہے، سوائے تمہارے کسی آدمی کی صورت نظر نہیں آئی ۔ اس شہر کے لوگ کہاں رہتے ہیں ۔ ؟"

لڑکے نے کہا ۔ "اس شہر میں آدمی نہیں رہتے، صرف مشینیں ہیں اور بٹن ۔"

"آدمی کہاں گئے ۔ ؟" یوسف نے پوچھا ۔

"وہ سب مر گئے یا مار دیئے گئے ۔" لڑکے نے افسردگی سے کہا ۔

"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں ۔ ؟" یوسف نے پوچھا ۔

"وہ بھی مر گئے ۔ میرے والد اس شہر کے مالک تھے ۔ ان کا نام تم نے سنا ہوگا ۔ مونو رام درلا ۔ !"

"ہاں ہاں سنا تو ہے ہمارے راجہ کے بہت گہرے دوست تھے ۔"

"انہیں روپیہ کمانے کا بہت شوق تھا۔ اس کے لئے انہوں نے اس شہر میں جگہ جگہ کارخانے کھولے تھے جن میں ہزاروں مزدور کام کرتے تھے۔ میرے پتا جی کو نئی نئی مشینیں منگانے کا بہت شوق تھا۔ جب کبھی کوئی مشین آتی وہ ایک کی بجائے ایک سَو مزدوروں کا کام کرتی۔ میرے پتا جی کارخانہ میں وہ مشین لگا لیتے اس پر کام کرنے کے لئے ایک مزدور رکھ لیتے اور باقی ننانوے مزدوروں کو نکال دیتے۔ اس طرح جوں جوں مشین بڑھتی گئیں لوگ بیکار ہوتے گئے اور بھوک سے مرنے لگے۔"

"کیوں ایسا کیوں کیا تمہارے پتا جی نے؟ جب ایک مشین سَو مزدوروں کا کام کرتی تو تمہارے پتا جی سَو مزدوروں ہی کو کام پر لگا رکھتے مگر ہر ایک سے تھوڑا تھوڑا کام لیتے یعنی بارہ گھنٹے کی بجائے بارہ منٹ۔"

"مگر پتا جی ایسا نہیں سوچتے تھے۔ ان کا کہنا تھا میرے مزدور بارہ گھنٹے کام کرتے تھے تو اب بھی ان کو بارہ گھنٹے ہی کام کرنا چاہیے چاہے مزدور ایک رہے یا سَو۔"

"مگر یہ کیوں۔؟ مشین آدمی کے لئے ہے۔ آدمی مشین کے لئے نہیں ہے۔ اچھی اور تیز کام کرنے والی مشین کا فائدہ آدمی کو بھی ملنا

چاہیئے۔ تاکہ اس کی محنت کم ہو۔ سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔"

"مگر میرے پتا جی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ مزدور کم کر دینے پر تیار تھے مگر مزدور کے کام کا وقت کم کرنے کو تیار نہ تھے۔ کہتے تھے اس سے مزدور بگڑ جائیں گے۔ مشین بگڑ جاتی ہے۔ تو اس کا پرزہ نیا ڈال دینے سے اُسے ٹھیک کر لیتے ہیں، لیکن مزدور اگر بگڑ جائے تو پھر اسے کون سنبھالے گا۔؟"

"عجیب الٹی کھوپڑی کے مالک تھے تمہارے پتا جی۔"

"سنو تو۔" لڑکے نے کہا۔ "ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ جب سب کام مشین کرنے لگیں۔ اور سب طرف بیکاری اور بھوک بڑھنے لگی تو لوگ مرنے لگے۔ مگر پتا جی بہت خوش تھے کیوں کہ ان کا نفع بڑھ رہا تھا۔ پھر ایک دن وہ آیا کہ قحط سے بازار کے بازار خالی ہو گئے۔ بازاروں میں سب سامان تھا۔ مگر لوگوں کے پاس خریدنے کو پیسہ نہ تھا۔ اس لئے تھوڑے دنوں میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں بھوک سے مر گئے۔ بہت سے لوگ بغاوت میں مارے گئے جو بچے وہ شہر سے بھاگ گئے۔ ایک دن اس شہر میں صرف تین آدمی رہ گئے۔ میں اور میرے پتا جی اور میری ماتا جی۔ پھر میرے پتا جی نے خودکشی کر لی۔ کیونکہ اس شہر میں اب کوئی آدمی نہ

رہتا تھا اس لئے اب انہیں نفع بھی نہ ہوتا تھا۔ تم جانتے ہو نفع مشینوں سے نہیں ہوتا، آدمیوں سے ہوتا ہے۔ جب کوئی آدمی ہی نہ رہا تو پتا جی کس سے نفع کماتے! آخر میں بے چارے میرے پتا جی اس غم کو سہار نہ سکے اور خودکشی کر کے مر گئے۔ تین سال ہوئے ___ میری ماتا جی بھی چل بسیں۔ تب سے میں اس شہر میں اکیلا ہوں۔ اور مشینوں کے بٹن دبایا کرتا ہوں۔ یا فرصت میں سینما دیکھتا ہوں۔ مگر کوئی تصویر بھی ایسی نہیں ملتی جو بچوں کے لئے ہو۔ اس لئے میں نے تنگ آ کر سب فلم ڈائرکٹروں کو الو بنا کر درخت پر رکھ دیا ہے۔ تم نے راستے میں ان کو دیکھا ہوگا۔؟"

"ہاں۔ مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہاری انگلیاں کس نے کاٹ ڈالیں۔"

"میرے پتا جی نے۔ بات یہ تھی کہ مجھے ہاتھ سے کام کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اور وہ کہتے تھے۔ کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کام مشینوں کو کرنے دو۔ آدمی کو صرف بٹن دبانا چاہیئے۔ اس لئے انہوں نے میری انگلیاں کاٹ ڈالیں۔" لڑکے نے بڑی افسردگی سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

یوسف نے کہا۔ "تم میرے ساتھ چلو۔ اس شہر کو چھوڑ دو۔ یہ

شہر نہیں ہے منافع خوروں کا قبرستان ہے۔"

لڑکے نے کہا۔ "تمہارے ساتھ جا کے کیا کرونگا۔؟"

یوسف نے کہا۔ "درخت پر چڑھیں گے۔ نئی دنیا دیکھیں گے طرح طرح کے لوگ دیکھنے میں آئیں گے۔"

لڑکے نے کہا۔ "مگر میں درخت پر کیسے چڑھوں گا۔؟ میں تو صرف بٹن دبا سکتا ہوں۔"

یوسف نے کہا۔ "وہ میں سکھا دوں گا۔ تم چلو تو۔ کیا نام ہے تمہارا۔"

"صفر صفر۔ ایک (۱۰۰)"

"یہ کوئی نام ہے کیا۔؟ مجھے تو ٹیلیفون کا نمبر معلوم ہوتا ہے۔"

لڑکے نے کہا "ہمارے شہر میں آدمیوں کے نام نہیں ہوتے، نمبر ہوتے ہیں۔ میرا نمبر صفر صفر ایک ہے۔"

یوسف نے کہا۔ "میں آج سے تمہیں موہن کہوں گا۔"

"موہن۔؟" صفر صفر ایک نے دہراتے ہوئے کہا۔ "اچھا نام معلوم ہوتا ہے۔ موہن گھنٹی کی طرح بجتا ہے۔"

جب موہن یوسف کے ساتھ چلنے لگا تو اس نے شہر پر ایک آخری نظر ڈالی اور افسوس سے کہنے لگا۔

"مگر یہ اتنا بڑا شہر، یہ خوب صورت سڑکیں، کارخانے، کاریں

مکان، گھر، گلی کوچے، بازار، دولت کے انبار۔ ان سب کا کیا ہوگا؟"

"آدمی کے بغیر ان کی کوئی قیمت نہیں۔ ان تمام چیزوں کی قیمت آدمی سے ہوتی ہے۔ کپڑے آدمیوں کے پہننے کے لئے ہوتے ہیں۔ مٹھائیاں بچوں کے کھانے کے لئے ہوتی ہیں۔ سڑکیں راہگیروں کے گزرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ لیکن اگر کارخانے میں مزدوروں کے ہاتھ کام نہ کرتے ہوں اور گھروں میں عورتوں کی ہنسی نہ سنائی دیتی ہو اور گلی کوچوں میں بچوں کے شور مچانے کی آوازیں نہ آتی ہوں ——— کیا تم نے کبھی کسی گلی کوچے میں شور مچایا ہے۔؟"

"شور مچانا کسے کہتے ہیں۔" موہن نے بڑی اداس نگاہوں سے یوسف کی طرف دیکھ کے کہا۔

یوسف نے اپنی بات نامکمل رہنے دی۔ اس نے موہن کو بازو سے گھسیٹ کر کہا۔

"جلدی یہاں سے بھاگ چلو ورنہ یہ خاموش شہر تمہیں کھا جائیگا۔ ابھی دس ہی سال کی عمر میں تمہارے چہرے پر جھریاں دیکھ رہا ہوں۔"

یوسف موہن کو بازو سے پکڑ کر کیمرے کی آنکھ سے باہر نکل آیا۔ باہر درخت کی ٹہنی پر فلم ڈائرکٹر بیٹھے بڑی سنجیدگی سے ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔

"میں تم سے بڑا ڈائرکٹر ہوں۔"

دوسرا کہہ رہا تھا۔ "نہیں میں تم سے بڑا ہوں۔"

پہلے ڈائرکٹر نے کہا۔ "اس کا ثبوت۔؟"

دوسرے ڈائرکٹر نے کہا۔ "اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اس درخت کی ٹہنی پر الٹا لٹک سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور درخت کی ٹہنی سے چمگادڑ کی طرح الٹا لٹک گیا۔

پہلے ڈائرکٹر نے کہا۔ "میں نے تمہاری فلمیں دیکھ کر ہی معلوم کر لیا تھا کہ وہ فلمیں بھی تم نے کیمرے سے الٹا لٹک کر بنائی ہیں۔"

یوسف نے موہن سے کہا۔ "ان لوگوں کی بحث میں پڑنا ہم بچوں کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ آؤ ہم لوگ آگے چلیں۔"

درخت کی ٹہنی پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ پھر درخت کے تنے پر آ پہنچے۔ موہن نے یہ بڑی ہوشیاری کی کہ وہ ایک ٹارچ لے آیا۔ اس

ٹارچ کی روشنی میں دونوں دوست درخت کے اوپر چڑھنے گئے۔ آگے موہن پیچھے یوسف تاکہ موہن اگر کبھی درخت سے گرنے لگے تو پیچھے سے یوسف اسے سنبھال لے۔ موہن اپنے انگوٹھے کی مدد سے بڑی محنت اور مشکل سے درخت پر چڑھتا جاتا اور یوسف اسے ٹارچ دکھاتا جاتا تھا تھوڑی دور تاریکی میں چڑھنے کے بعد دھیمی دھیمی روشنی نظر آنے لگی۔ ایسی روشنی جیسی چاندنی رات میں ہوتی ہے۔ آگے جاکے انہوں نے دیکھا کہ درخت کی ایک اونچی ڈال پر ایک پنجرا لٹکا ہوا ہے اور اس میں چاند بند ہے۔

اس پنجرے کے پاس ایک عجیب شکل کا دیو بیٹھا ہے جس کی رنگت چاندی کی سی ہے۔ اس دیو کی آنکھیں چاندی کی تھیں اور جب وہ بات کرتا تھا تو اس کے منہ سے لفظوں کے بجائے روپے نکلتے تھے۔ اور یہ روپے کھنکھناتے ہوئے، عجیب سی آواز پیدا کرتے ہوئے نیچے ایک بہت بڑی چاندی کی طشتری میں گرتے جاتے تھے۔ اس طشتری کے بیچ میں ایک بڑا سوراخ تھا جس میں ایک نلی لگی تھی جس کا ایک سرا طشتری میں اور دوسرا سرا اس دیو کی ناف میں لگا ہوا تھا۔ چنانچہ روپے دیو کے ہونٹوں سے گرتے، آواز پیدا ہوتے ہوئے طشتری میں کھنکھناتے اور سوراخ سے غائب ہو کر

نلی میں ہوتے ہوئے دیو کی ناف کے اندر چلے جاتے۔ یوسف نے ان گرتے ہوئے روپوں کو جب ہاتھ سے پکڑنا چاہا تو اس نے 'سی' کرکے جلدی سے ان روپوں کو چھوڑ دیا، کیوں کہ روپے آگ کی طرح تپ رہے تھے۔ یوسف اپنے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا ہاتھ جل گیا تھا، ہتھیلی پر جگہ جگہ چھالے پڑ گئے تھے۔

موہن نے پوچھا۔ "اب تم درخت پر کیسے چڑھو گے۔؟"

دیو نے ہنس کر کہا۔ "آگے جانے کی کیا ضرورت ہے۔؟ ہماری دنیا میں رہو۔"

موہن نے پوچھا۔ "تمہاری دنیا کون سی ہے۔؟"

دیو نے اپنے قریب ہی رکھے ایک بہت بڑے ڈھول کو اٹھا کر اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ یہ ڈھول بڑا عجیب و غریب تھا۔ یہ ڈھول بڑا عجیب و کا بنا ہوا تھا۔ اور جو پردے ہوتے ہیں وہ دو رنگ کے تھے۔ ایک طرف کی کھال کالی تھی اور دوسری طرف کی سفید۔

یوسف نے پوچھا۔ "اے بڑے دیو، اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔"

چاندی کے دیو نے بڑی نخوت سے کہا۔ "بول کیا کہتا ہے۔

تیری جان بخش دی ہم نے۔ باادب باملاحظہ ہوشیار، بول کیا بکتا ہے۔؟"

یوسف نے کہا۔ "آپ کا یہ ڈھول لکڑی کی بجائے ہڈیوں کا کیوں ہے۔؟"

دیو نے کہا۔ "لکڑی بہت مہنگی ہوتی ہے۔ اس لئے میں نے ڈھول کو انسان کی ہڈیوں سے بنا رکھا ہے اور اس پر چمڑا بھی انسان کا منڈھا ہوا ہے۔ کیونکہ دوسرے جانوروں کا چمڑا بہت مہنگا آتا ہے۔"

موہن نے پوچھا۔ "مگر ایک خول کالا ہے دوسرا سفید ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے۔؟"

دیو نے کہا۔ "ایک کالے آدمی کا چمڑا ہے۔ دوسرا سفید آدمی کا چمڑا ہے۔ مگر میں دونوں کو ایک ہی چھڑی سے پیٹتا ہوں۔"

پھر چاندی کے دیو نے ڈھول کو پیٹتے ہوئے چلانا شروع کیا۔

"ڈم۔ ڈم۔ ڈم آجاؤ۔ جادو کی دنیا دیکھو۔ انسان کے انبار دیکھو۔

" لاکھ۔ صرف چار آنے ڈم۔ ڈم ڈم۔"

یوسف نے کہا۔ "مگر ہمارے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

موہن نے کہا۔ "نہیں میری جیب میں آٹھ آنے ہیں۔"

موہن نے دیو کو آٹھ آنے دیئے اور جادو کی دنیا کے اندر داخل

ہو گئے۔ اندر جا کر یوسف اور موہن نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا لق و دق صحرا ہے۔ زمین بنجر ہے۔ جگہ جگہ ریت کے ٹیلے ہیں۔ صحرا کے بیچ میں ایک لمبا سا راستہ ہے جس پر انسان کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں اور اس راستہ پر لاکھوں انسان آہ و زاری کرتے ہوئے، ایک دوسرے کو ڈھکیلتے ہوئے۔ آگے چل رہے ہیں۔ ان دونوں لڑکوں نے دیکھا کہ ہر انسان کے پاؤں میں سونے کی زنجیر پڑی ہوئی ہے اور یہ زنجیر اگلے آدمی کی زنجیر سے بندھی ہوئی ہے۔ یہ لوگ بہت کمزور نظر آتے تھے۔ ان سے بڑی مشکل سے چلا جاتا تھا۔ اور بہت سے لوگ تو ایسے تھے کہ ان کے جسم کی پسلیاں تک الگ الگ نظر آتی تھیں۔ یوسف نے پوچھا۔

"تم لوگ کون ہو۔؟"

ایک آدمی نے کہا۔ "ہم لوگ سونے کے دیو کے غلام ہیں۔ اس نے ہم کو قید کر رکھا ہے۔"

یوسف نے کہا۔ "سونے کا دیو کہاں ہے۔؟"

"وہ تم کو آگے ملے گا۔"

"آگے کہاں۔؟"

"جہاں یہ راستہ ختم ہوتا ہے۔"

جہاں پر راستہ ختم ہوتا تھا وہاں پر واقعی سونے کا دیو بیٹھا تھا۔ اس کی صورت شکل چاندی کے دیو سے ملتی جلتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جب وہ بات کرتا تھا تو اس کے منہ سے روپوں کی بجائے اشرفیاں گرتی تھیں اور چاندی کی طشتری کی بجائے سونے کی طشتری میں گر کے دیو کی ناف میں غائب ہو جاتی تھیں۔

دیو نے لڑکوں سے کہا۔ "تمہارا ٹکٹ کہاں ہے۔؟"

لڑکوں نے ڈرتے ڈرتے اپنے ٹکٹ دکھائے۔ سونے کے دیو نے کہا۔ "اچھا ہے تمہارے پاس ٹکٹ ہیں۔ ورنہ میں تمہیں بھی غلام بنا لیتا۔ اچھا اب میرا تماشہ دیکھو۔"

اتنا کہہ کر دیو نے اپنے سامنے کھنچے ہوئے ایک پردے کو ہٹایا۔ اور دونوں بچوں نے دیکھا کہ سامنے، لق ودق صحرا میں ایک بہت بڑی دیوار کھڑی ہے۔ اور یہ دیوار ساری کی ساری سونے کی ہے۔ اتنی بڑی سونے کی دیوار انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی مگر یہ دیکھ کر ان کو اور بھی اچنبھا ہوا کہ اس دیوار کی بنیادوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ بنے ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے دیوزادے اُن طلائی زنجیروں کو کھینچ کھینچ کر ان سوراخوں میں ڈال رہے ہیں، جو انسانوں کے پیروں میں بندھی ہوئی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔؟" موہن نے پوچھا۔

دیو نے کہا۔ "یہ میں سونے کی دیوار اگا رہا ہوں۔"

"سونے کی دیوار بھی اگتی ہے۔؟" موہن نے حیران ہو کے پوچھا۔

دیو نے کہا۔ "جتنی دیر تمہیں آئے ہوئے ہوئی ہے۔ اتنی دیر میں یہ دیوار دو فٹ اونچی ہو گئی ہے۔ دیکھو غور سے دیکھو، تمہیں دیوار اگتی ہوئی معلوم ہوگی۔"

بچوں نے غور سے دیکھا۔ واقعی دیوار بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یوسف نے دیوزادوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ جو دیوزادے ہیں ———— یہ وہاں سونے کی دیوار کے پاس کیا کر رہے ہیں۔؟"

"اس کی بنیادوں کو سینچ رہے ہیں۔"

یکایک دیو نے تالی بجا کر کہا۔ "کھل سم سم۔" اور دیوزادوں نے اپنی طلائی زنجیروں کو سوراخ میں ڈال دیا۔ اور موہن اور یوسف نے دیکھا کہ وہ طلائی زنجیریں نہ تھیں، طلائی نلیاں تھیں۔ جن میں سے انسانی خون بہہ کر سونے کی دیوار کے سوراخوں میں جا رہا تھا۔

یوسف نے گھبرا کے کہا۔ "مگر یہ تو انسانی خون ہے۔"

دیو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مگر یہ بھی تو دیکھو کہ دیوار کتنی اونچی

ہوگئی ہے۔"

٭

یوسف اور موہن وہاں سے سر پہ پاؤں رکھ کے بھاگے. بھاگتے بھاگتے جادو کی دنیا کے بالکل دوسرے حصے میں نکل آئے یہاں پر ایک چبوترے کے اردگرد بہت سے لوگ جمع تھے. سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں ہوں گے. چبوترے کی طرف دیکھ دیکھ کے بولی دے رہے تھے۔

"دس ہزار۔"

"تیس ہزار۔"

"چالیس ہزار۔"

موہن نے پوچھا، "کیا بات ہے۔ کس چیز کی بولی لگ رہی ہے۔"

یوسف نے کہا۔ "آؤ آگے بڑھ کے دیکھیں۔"

چبوترے کے قریب جاکے انہوں نے دیکھا کہ ایک لوہے کے ستون سے لوہے کی زنجیروں سے بندھی ہوئی ایک بڑی ہی خوبصورت شہزادی ہے۔ اس کے نازک ریشمی بال کمر تک لٹک رہے ہیں۔ اس کی کنول کی ڈنڈی کی طرح لانبی گردن ایک طرف کو جھکی ہوئی ہے اور آنسو اس کی آنکھوں سے برابر بہہ رہے تھے۔ مگر یوسف اور موہن کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس کی آنکھوں سے جو آنسو گر رہے ہیں۔ دراصل وہ آنسو نہیں ہیں۔ شفاف موتیوں کے دانے ہیں جو اس کی آنکھوں سے نکل کر نیچے زمین پر گرتے جاتے ہیں۔ جہاں ایک آدمی قرمزی رنگ کے غالیچے پر بیٹھا اطمینان سے انہیں چنتا جاتا ہے اور بولتا جاتا ہے۔ "بولو۔ بولو۔ دام لگاؤ۔ یہ کوئی معمولی شہزادی نہیں ہے۔ روتی ہے تو اس کی آنکھوں سے موتی گرتے ہیں۔ دیکھتے جاؤ اور دام لگاتے جاؤ۔"

"ایک لاکھ۔" ایک آدمی نے گھبرا کر کہا۔

"دو لاکھ۔" "دس لاکھ"۔ "چالیس لاکھ۔"

بولی بڑھ رہی تھی۔

موتی زمین پر گر رہے تھے۔

موہن نے کہا۔ "تم اس کی کیا بولی دو گے۔ ؟"

یوسف نے کہا۔ "میں تو ایک پیسہ بھی نہ دوں گا۔ مجھے تو روتی ہوئی شہزادی ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔ مجھے تو ہنستی ہوئی شہزادی چاہیئے۔

موہن نے کہا۔ "مگر سوچو تو یہ موتیوں کی رانی ہے۔"

یوسف نے کہا۔ "پھر کیا ہوا۔ ؛ یہ بھی تو سوچو موتی حاصل کرنے کے لئے اسے ہر وقت رلانا پڑیگا۔ اسے طرح طرح کی تکلیفیں دینی پڑینگی تب کہیں یہ موتی ملیں گے۔ میں تو اس ظلم کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

موہن نے کہا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر اس بے چاری کو کسی نہ کسی طرح بچانا چاہیئے۔"

یوسف نے کہا۔ "شہزادی تمہیں اچھی لگتی ہے۔ ؟"

موہن نے کہا۔ "میرے پاس ایک کہانیوں کی کتاب تھی۔ میرے باپ نے وہ کتاب چھین کے پھاڑ ڈالی۔ اس میں اسی شہزادی کی تصویر تھی۔"

یوسف کچھ دیر چپ رہا پھر اس نے وہیں سے چلا کر کہا۔ "اے شہزادی، اب ذرا ہنس کر تو دکھاؤ۔"

موتی چننے والا آدمی زور سے چلایا۔ "خبردار جو ہنسی، جان سے مار ڈالوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے زور سے شہزادی کی پیٹھ پر چابک لگایا۔ یوسف نے پھر زور سے کہا: "اگر پٹنا نہیں چاہتی ہو تو ہنسو، زور سے ہنسو۔ تکلیف بھی ہو، درد بھی ہو۔ تو بھی ہنسو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔

شہزادی نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ یکایک اس کی آنکھوں سے موتی گرنا بند ہو گئے اور ہونٹوں سے پھول جھڑنے لگے مگر یہ معمولی پھول تھے۔ جیسے گلاب، جوہی، اور نرگس کے پھول۔ خریداروں کو ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نیلام کرنے والا دھڑا دھڑ چابک لگاتا گیا۔ پھر بھی شہزادی ہنستی گئی۔ خریدار گھبرا کے بھاگ گئے۔ کیونکہ وہ موتیوں کے خریدار تھے، پھولوں کے خریدار نہیں تھے۔

تھوڑی دیر میں چاروں طرف اُلّو بولنے لگے۔ پھر نیلام کرنیوالا بھی چابک مارتے مارتے خود بے ہوش ہو کر گر گیا۔ کیونکہ وہ پھولوں کی خوشبو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اس دن تک نہ پھول دیکھے تھے اور پھولوں کی خوشبو سونگھی تھی۔ اس لئے وہ بیچارا بیہوش ہو کر وہیں پھولوں کے انبار پر گر گیا۔ موہن اور یوسف نے آگے بڑھ کر شہزادی کی زنجیریں کھول ڈالیں۔ اور اسے چبوترے سے نیچے اتارا اور اسے اپنے ساتھ لے چلے۔

چلتے چلتے موہن نے شہزادی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شہزادی بہت ہنسی اور بولی۔ "تمہارے ہاتھ میں تو صرف ایک انگوٹھا ہے۔"

جونہی وہ ہنسی، اس کے ہونٹوں سے ایک ساتھ بہت سے پھول جھڑ پڑے۔ جہاں پھول جھڑ کر زمین پر گرے وہاں بہت سے پھولوں کے پودے اگ آئے۔ اس طرح جہاں جہاں سے شہزادی یوسف اور موہن گذرتے گئے اس لق ودق صحرا کو گلزار بناتے گئے۔ موہن کو چونکہ شہزادی مل گئی۔ اس لئے وہ بہت خوش تھا۔ یوسف سے کہنے لگا۔ "بھائی چلو واپس چلیں۔"

یوسف نے کہا۔ "ابھی اس جادو کی دنیا کی اور تھوڑی سی سیر کرلیں۔ چار آنے کا ٹکٹ لیا ہے۔ کوئی مفت تھوڑے ہی آگئے ہیں۔ دیکھو وہ سامنے کیا ہے۔؟"

جادوگروں کا الیکشن

سامنے بہت سے لوگ رنگ برنگی جھنڈیاں ہلاتے ہوئے جا رہے تھے۔ یوسف موہن اور شہزادی بھی ان لوگوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ مجمع زور زور سے نعرے لگا رہا تھا۔ "الہ دین کو ووٹ دو۔ جو الہ دین کو ووٹ نہیں دے گا۔ وہ ملک کا غدار ہوگا۔ الہ دین زندہ باد۔!"

مجمع اس طرح نعرے لگاتا ہوا جھنڈیاں ہلاتا ہوا شہر کے ایک بڑے چوک میں پہنچا۔ یوسف نے دیکھا لوگ بھوکے نظر آرہے ہیں، ان کے کپڑے بوسیدہ اور تار تار ہیں۔ مگر پھر بھی وہ خوش نظر آرہے ہیں۔ یوسف نے پوچھا۔ "بھئی کیا ماجرا ہے۔؟"

ایک آدمی نے حیرت سے کہا۔ "ساری دنیا کو معلوم ہے اور تمہیں معلوم نہیں۔؟ آج جادوگروں کا الیکشن ہے۔ وہ دیکھو سامنے الہ دین اپنا چراغ ہاتھ میں لئے الیکشن لڑ رہا ہے۔"

یوسف نے دیکھا۔ واقعی بڑے بڑے رنگا رنگ کے جھنڈوں
کے درمیان الہ دین کھڑا تقریر کر رہا تھا۔

الہ دین کہہ رہا تھا: "بھائیو اور بہنو! میں بھی تمہاری طرح ایک
معمولی آدمی ہوں۔ میں ایک درزی کا بیٹا ہوں۔ میں تمہارے دکھ درد
پہچانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم لوگ بھوکے ہو، غریب ہو تمہارے
جسم پر کپڑے نہیں ہیں، بچوں کے لئے تعلیم نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے
پچھلی حکومت نے تمہارے لئے کچھ نہیں کیا۔ مگر وہ سونے کے دلیے
کی حکومت تھی۔ میں درزی کا بیٹا ہوں۔ میں تمہارے سب دکھ درد
دور کروں گا۔ اپنے اس جادو کے چراغ کی مدد سے میں تمہارے لئے
ہر طرح کے عیش کا سامان مہیا کر دوں گا۔ دیکھئے میرے جادو کے چراغ
کے کرشمے۔"

یہ کہہ کر الہ دین نے جادو کے چراغ کو اپنی ہتھیلی سے رگڑا۔ فوراً
ایک جن ہوا میں اڑتا ہوا نظر آیا۔ اور ہوا ہی میں کھڑا ہو کر کہنے لگا۔
"الہ دین کیا ارشاد ہے؟"

الہ دین نے کہا: "میں شہر کے بے گھر لوگوں کے لئے عالی شان محل
بنانا چاہتا ہوں۔ ذرا ایک محل لا کے دکھا دو۔"

جن نے سر جھکایا اور غائب ہو گیا۔ دوسرے لمحے وہی جن اپنے

ہاتھ پر ایک عالی شان سات منزلوں والا چمکتا ہوا محل لئے حاضر
ہوا۔ لوگوں کی نگاہیں اس خوب صورت محل کی طرف کھنچتی چلی گئیں۔
محل کے دروازے کھلے تھے۔ کھڑکیاں کھلی تھیں محل کے اندر روشنیاں
جگ مگ جگ مگ کر رہی تھیں۔ اندر کمروں میں باجے بج رہے تھے۔
خوب صورت قالین اور صوفے بچھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ لمبی لمبی،
میزوں پر طرح طرح کے پھل چنے ہوئے تھے۔ مرغن کھانے، بھنے
ہوئے مرغ پلاؤ متنجن، زردے، قورمے، طرح طرح کی سبزیاں،
فالودے، فیرنیاں، شربت، آئس کریم گھومتی ہوئی میزوں پر رکھی
ہوئی لوگوں کو نظر آ رہی تھیں۔ لوگوں کی رال ٹپکنے لگی۔

لاکھوں گلوں سے آواز آئی۔

"الہ دین کو ووٹ دو۔ الہ دین زندہ باد۔ ایک ووٹ، ایک
ملک۔ ایک الہ دین، ایک چراغ۔!"

یکایک الہ دین نے تالی بجائی۔ جن اپنے محل سمیت غائب ہو گیا
الہ دین نے کہا۔ "پہلے مجھے ووٹ دو۔ پھر یہ محل تمہیں ملے گا۔"
لوگ دھڑا دھڑ ووٹ دینے کے لئے جانے لگے۔ یکایک
دوسری طرف سے آواز آئی۔

"لوگو! بیوقوف نہ بنو۔ یہ الہ دین درزی کا بیٹا تمہیں بیوقوف

بتا رہا ہے۔ اصلی جادو تو میرے پاس ہے۔ جادو کی ٹوپی۔ سلیمانی ٹوپی"

لوگوں کا مجمع دوسری طرف پلٹ پڑا جہاں ایک بہت بڑے بینڈ باجے کے ساتھ، ایک بہت بڑے چبوترے پر، دو درجن لاؤڈ اسپیکروں کے سامنے ایک جادوگر سلیمانی ٹوپی ہاتھ میں لئے تقریر کر رہا تھا۔ یوسف، موہن اور شہزادی بھی ادھر چلے گئے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"الہ دین ٹھگ ہے، اسے ہرگز ووٹ نہ دینا۔ الہ دین کا چراغ پرانا ہو چکا ہے۔ اس کا جن بھی بڈھا ہو چکا ہے۔ اتنے دنوں سے وہ تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکا، اب کیا کرے گا۔؟ اب کے تم مجھے ووٹ دو، کیونکہ میرے پاس سلیمانی ٹوپی ہے۔ یہ ٹوپی میں نے بڑی مشکل سے حاصل کی ہے۔ ہزاروں تکلیفیں سہہ کے اپنی جان کی بازی لگا کے، بڑی مصیبتوں کے بعد میں نے اس ٹوپی کو حاصل کیا ہے۔"

موہن نے کہا: "اس ٹوپی میں کیا خاص بات ہے۔؟ مجھے تو سیدھی سادھی سفید رنگ کی ٹوپی دکھائی دیتی ہے"

جادوگر نے موہن کی بات سن لی۔ وہ وہیں اپنے چبوترے سے چلا کر بولا۔ "یہ کوئی معمولی ٹوپی نہیں ہے۔ اسے پہن کر آدمی یوں غائب ہو جاتا ہے۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ دیکھو دیکھو سلیمانی ٹوپی کا کمال دیکھو۔" یہ کہہ کر جادوگر نے سلیمانی ٹوپی

پہن لی اور موہن یوسف۔ مجمع کے درمیان سے یکایک غائب ہو گیا۔ اب صرف اس کی آواز آ رہی تھی۔

"دیکھا، یہ سلیمانی ٹوپی کا کمال ہے۔! اسے پہن کر آدمی غائب ہو سکتا ہے۔"

جادوگر نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور اب وہ لوگوں کو نظر آنے لگا

"اس ٹوپی کو پہن کر آدمی غائب ہو سکتا ہے۔ جہاں چاہے گھوم سکتا ہے۔ وہ ساری دنیا کی سیر کر سکتا ہے۔ وہ جہاں چاہے بغیر ٹکٹ کے جا سکتا ہے۔ اور اسے کوئی ٹوکنے والا نہیں۔ اس ٹوپی کو پہن کر آدمی بڑے بڑے راز معلوم کر سکتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کے بڑے بڑے راز۔! وہ اونچی سے اونچی سوسائٹی میں جا سکتا ہے اور کوئی اسے ٹوک نہیں سکتا۔ اس ٹوپی کو پہن کر آدمی وزیر بن سکتا ہے۔ نوکری حاصل کر سکتا ہے۔ یہ سلیمانی ٹوپی ہے اس کے سامنے الہ دین کا چراغ بالکل ہیچ ہے۔ اسے رگڑنے کی ضرورت نہیں۔ کسی جن کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ بس اسے سر پہ پہن لیجئے آپ کے سب کام پورے ہو جائیں گے۔ پھر الہ دین کے پاس ایک ہی چراغ ہے۔ لیکن میں نے سب کے فائدے کے لئے ہزاروں سلیمانی ٹوپیاں تیار کرائی ہیں۔ یہ بنڈل کے بنڈل جو آپ چبوترے پر دیکھ رہے ہیں۔

یہ سب سلیمانی ٹوپیوں کے ہیں۔ آیئے، مجھے ووٹ دیجئے۔ اور ایک سلیمانی ٹوپی لیتے جایئے۔ ایک ووٹ، ایک سلیمانی ٹوپی۔"

لوگ دھڑا دھڑ ووٹ دینے کے لئے بھاگنے لگے اور شور مچانے لگے۔ "سلیمانی ٹوپی زندہ باد۔ الہ دین کا چراغ مردہ باد!"

"ہاہا۔" تیسرے چبوترے سے ایک زور کا قہقہہ بلند ہوا۔

سب لوگ ادھر دیکھنے لگے۔ وہاں ایک اور جادوگر سر پہ سفید کاغذ کی ٹوپی رکھے، سفید کاغذ کا کوٹ پہنے، آنکھوں پر چشمہ لگائے ہاتھ میں اخبار لئے ہوئے ہنس رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"دوستو! یہ سلیمانی ٹوپی والا بہروپیا ہے۔ بہروپیا۔ یہ خود تو ووٹ لے کر غائب ہو جائے گا۔ اور آپ کو کپڑے کی ٹوپیاں دے جائیگا۔ چاہے آپ ان کو سر پہ پہنیئے۔ چاہے۔ تھیلا بنا کر گھر لے جایئے۔ دوستو یہ سلیمانی ٹوپی کس کام کی۔؟ غائب ہو کر آپ کیا کرینگے۔؟ اگر آپ کو اس جادو کی دنیا میں رہنا ہے تو سچا جادو تلاش کرنے کی کوشش کیجئے۔ اور سچے جادوگر کو اپنا بادشاہ بنایئے۔ مجھے دیکھئے۔ میرا جادو کسی کو غائب نہیں کرتا۔ کوئی ہوائی محل نہیں دکھاتا۔ میں ابھی آپ کے سامنے وہ چیز رکھتا ہوں جس کی آپ کو ضرورت ہے۔"

جادوگر نے انگلی سے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "کہو تم کیا چاہتے ہو؟"

اس آدمی نے کہا۔ "مجھے اپنی زمین میں کنواں چاہیے۔"

جادوگر نے اپنے چبوترے پر پڑے کاغذ کے انبار میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکالا اور اس پر کچھ منتر پڑھ کے پھونکا اور اس آدمی کو دیا۔ اسے اس کاغذ پر اپنے کھیتوں کی تصویر نظر آئی۔ کھیت بنجر پڑے تھے۔ یکایک اسے بیچ میں ایک کنواں نظر آیا۔ کنویں پر رہٹ چلنے لگا۔ پانی فوارے کی طرح نکل کر کھیتوں کو سیراب کرنے لگا۔ آدمی کے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے دیکھا اس کے جھونپڑے سے اس کی بیوی نکلی پانی کا گھڑا لئے ہوئے۔ بیوی نے مسکرا کر خاوند کی طرف دیکھا اور خاوند اسی وقت وہ کاغذ ہاتھ میں لے کے اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ وہ بھاگتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔

"مجھے مل گیا، میرا کنواں مجھے مل گیا۔"

"تمہیں کیا چاہیئے۔؟" جادوگر نے ایک دوسرے آدمی سے پوچھا۔

اس آدمی نے کہا۔ "ہمارے قصبے میں کوئی اسکول نہیں ہے۔"

جادوگر نے ایک دوسرا پرزہ کاغذ کا اٹھایا اور اس پر منتر پڑھ کے کچھ پھونکا اور پھر وہ پرزہ کاغذ کا اس آدمی کے ہاتھ میں دیدیا

اس آدمی نے غور سے اس کاغذ کی طرف دیکھا جہاں اس کا گھر تھا. اس کے بالکل قریب ایک نئی اور خوب صورت اسکول کی بلڈنگ کھڑی تھی. بچے کتابیں ہاتھ میں لئے جا رہے تھے. ایک خوبصورت باغیچے میں بچے کھیل رہے تھے. یکایک اسکول کے گیٹ پر اسے اپنے دو بچے نظر آئے. وہ دونوں ہاتھ ہلا کر اسے ہیلو پاپا، کہنے لگے. آدمی اسی وقت وہ کاغذ اپنے ہاتھ میں لے کے وہاں سے بھاگا. بھاگتے بھاگتے کہہ رہا تھا وہ —— "ہمیں اسکول مل گیا، ہمیں اسکول مل گیا۔"

پھر کیا تھا. مجمع جادوگر پر ٹوٹ پڑا۔

ایک بولا۔ "مجھے جوتا چاہیئے۔"

جادوگر نے اسے کاغذ کا پرزہ دیا۔

دوسرا بولا۔ "مجھے موٹر چاہیئے۔"

جادوگر نے اسے کاغذ کا پرزہ دیا۔

تیسرا بولا۔ "ہمیں اپنے گاؤں میں ایک ہسپتال چاہیئے، ایک اسکول ایک نہر ایک تھیٹر چاہیئے۔"

جادوگر نے اسے ایک کاغذ کا پرزہ دیا۔

موہن نے یوسف سے کہا۔ "تمہیں کاغذ پر کچھ نظر آتا ہے۔؟"

یوسف نے کہا۔ "مجھے تو سفید کاغذ ہی نظر آتا ہے۔"

موہن نے کہا۔ "ممکن ہے ان لوگوں کو کچھ نظر آتا ہو لیکن اگر مان لیا جائے کہ انہیں کچھ نظر آتا ہے تو آخر کاغذ پر ہی نظر آتا ہے نا۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔؟"

یوسف نے اس آدمی کو بازو سے پکڑ لیا۔ جس نے جادوگر سے جوتا مانگا تھا اور اس سے پوچھا۔

"تمہیں جوتا مل گیا۔؟"

اس آدمی نے بڑے غصّے سے کاغذ کا پرزہ یوسف کے منہ کے سامنے لا کر کہا۔ "دیکھتے نہیں ہو، مل گیا ہے۔ یہ دیکھو۔"

یوسف کو سفید کاغذ ہی نظر آیا۔

یوسف نے کہا۔ "اگر یہ جوتا ہے تو اسے پہن کر دکھاؤ۔؟"

اس آدمی نے کاغذ کے ٹکڑے کو اپنے پاؤں میں پہننے کی کوشش کی. کاغذ اسی وقت بیچ سے پھٹ گیا۔ چرر کی آواز سنتے ہی جادوگر زور سے گرجا۔ "کون ہے؟ کون حقیقت پسند گھس آیا ہے ہماری جادو کی دنیا میں۔ اسے جلدی نکالو۔ ورنہ یہ سب کچھ تباہ کر دیگا۔ ہمارا جادو سب ختم ہو جائے گا۔"

اتنا سنتے ہی الہ دین چراغ والا، سلیمانی ٹوپی والا، جادو کے کاغذ

والا اور ان کے حمایتی، یوسف موہن اور شہزادی کے پیچھے بھاگے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ یوسف نے بڑی چالاکی سے کام لیا۔ اس نے جلدی سے سلیمانی ٹوپیوں کے بنڈل سے تین ٹوپیاں نکالیں اور انہیں پہن کے مجمع کے بیچ میں سے غائب ہو گئے۔ ورنہ اتنا بڑا مجمع ان کے پیچھے پڑ جاتا تو ان کی ہڈی پسلی بھی نہ بچتی۔

ہانپتے ہانپتے تینوں جادو کی دنیا کے دروازے سے باہر آ گئے۔ باہر چاندی کا دیو بیٹھا چار آنے کے ٹکٹ بیچ رہا تھا۔ انہیں واپس آتے دیکھ کر بڑی عاجزی سے کہنے لگا۔

"تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے۔؟ تین سو سال سے بھوکا بیٹھا ہوں۔ میرے حال پر رحم کھاؤ اور کچھ کھانے کو دو۔"

یوسف اور موہن اور شہزادی نے سلیمانی ٹوپیاں دیو کے ہاتھ میں تھما دیں اور کہا۔

"اِن تینوں ٹوپیوں کو بلا کر بیچ دو پھر تمہیں سب کچھ مل جائے گا۔"

٭

جادو کی دنیا میں چونکہ انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ اس لئے موہن، یوسف اور شہزادی، تینوں بھوکے تھے۔ اور شہزادی تو بہت ہی بھوکی تھی کیونکہ اسے رُلانے کے لئے خاص طور پر بھوکا رکھا گیا تھا۔ اس لئے تینوں جادو کی دنیا سے واپس آتے ہی درخت سے پھل توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ کھاتے کھاتے موہن نے شہزادی سے پوچھا۔

"تم کس ملک کی شہزادی ہو۔؟"

شہزادی نے کہا۔ "میں تو سرے سے شہزادی ہوں ہی نہیں۔ میں تو ایک ڈبل روٹی بیچنے والے کی لڑکی ہوں۔"

"ہائیں، شہزادی نہیں ہو۔؟" موہن نے حیرت سے کہا۔ "مگر وہ تمہیں بیچنے والا تو ——————"

قصہ یہ ہے۔" شہزادی نے کہا۔ "شہر میں میرے باپ کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ جہاں وہ ڈبل روٹیاں پکایا کرتا تھا۔ میرا باپ، میری ماں اور میں، ہم تینوں خمیری آٹا گوندھتے تھے۔ اسے ڈبل روٹی کے سانچے میں بھر کر چولہے میں پکاتے تھے۔ خمیر اٹھا تا اسے سانچے میں ڈالنا سانچے

کو آگ میں بس اتنی دیر رکھنا کہ روٹی ٹھیک پک جائے، نہ کم زیادہ بہت مشکل کام ہے۔ پکتی ہوئی ڈبل روٹیوں کو باہر نکالنا اور تازہ روٹیوں کو چولہے میں رکھنا بھی بڑا مشکل کام ہے۔ اور میں چھوٹی سی تھی جو کھیلنا چاہتی تھی جبکہ مجھے کام کرنا پڑتا تھا۔ ایک دن کیا ہوا کہ میری ماں بیمار ہو گئی۔ اب مجھے اور میرے باپ کو دوکان پر کام کرنا پڑا۔ میں نے بہت سی روٹیاں جلا ڈالیں۔ اس پر میرے باپ نے مجھے خوب پیٹا، اور دوکان سے باہر نکال دیا۔ میں باہر سڑک پر کھڑی ہو کر رونے لگی۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔ میں نے اتنا دیکھا کہ ایک بڈھا میرے پاؤں پر جھکا ہوا زمین پر سے کچھ چن رہا ہے۔ بڈھا اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اور میری طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دوکان میں واپس لے گیا۔

اس بڈھے نے میرے باپ سے کہا۔ "اس چھوٹی سی بچی کو پیٹتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔"

باپ نے کہا۔ 'یہ میری بچی ہے میں اسے پیٹ سکتا ہوں، میں اس کا باپ ہوں، اسے میری دوکان پر کام کرنا ہوگا۔ مجھ پر بہت سا قرض چڑھا ہوا ہے۔ آج اس نے کئی درجن ڈبل روٹیاں جلا ڈالی ہیں اس نقصان کو کون برداشت کرے گا۔؟ میں یا تم۔؟ میں تو

بہت غریب ہوں اور ایک وقت کا کھانا بھی بڑی مشکل سے نکال پاتا ہوں۔ اس پر تم اس کی حمایت کرنے آگئے ہو۔ حالانکہ پہلی بار آج میں نے اسے پیٹا ہے۔"

"اگر تم غریب ہو اور اسے پال نہیں سکتے" تو اس لڑکی کو مجھے دیدو۔ میں اسے اپنی بیٹی بنا لونگا۔ اسے بہت اچھی طرح رکھونگا۔ اسے اچھے اچھے کپڑے پہناؤں گا۔ اچھے اچھے کھانے کھلاؤں گا۔ اچھی تعلیم دونگا۔ اور اچھے گھر میں رکھونگا۔

میرے باپ نے کہا۔ اور یہاں، اس کی جگہ میری دوکان پر کون کام کریگا۔؟ تم۔؟"

بڈھے نے کہا۔ اس کے عوض میں اس دوکان کا قرضہ اپنے ذمے لیتا ہوں اور تمہیں اتنی رقم اور دے دیتا ہوں کہ تم زندگی بھر آرام سے رہ سکتے ہو۔'

اتنا کہہ کر بڈھے نے اشرفیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی میرے باپ کے ہاتھ میں تھما دی۔ میرا باپ کبھی میری طرف دیکھتا تھا۔ کبھی تھیلی کی طرف۔ آخر اس نے تھیلی قبول کر لی اور بیٹی بیچ دی کیونکہ وہ بہت غریب تھا۔ پھر اس نے یہ بھی سوچا ہوگا۔ کہ چلو بیٹی اس امیر بڈھے کے گھر آرام سے رہے گی۔"

"تو تم نے اپنے باپ سے الگ ہوگئیں۔؟" یوسف نے پوچھا۔

"ہاں۔" شہزادی نے کہا۔ "وہ بڈھا ایک امیر جوہری تھا۔ مجھے اپنی خوب صورت گاڑی میں بٹھا کے اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ کیا تم ہر روز روتی ہو۔؟"

میں نے کہا۔ نہیں تو۔ میں تو ہر روز ہنستی رہتی ہوں۔ آج ہی پہلی بار روئی ہوں۔'

ہوں۔ یہ کہہ کر بڈھا کچھ سوچنے لگا۔ گھر لے جا کے بڈھے نے مجھے بڑے آرام سے رکھا۔ اچھے اچھے کھانے، خوب صورت کپڑے اور سیر کے لئے چار گھوڑوں والی گاڑی۔ اس کے گھر میں ہر طرح کا آرام تھا۔ بس ایک نقص تھا۔"

"وہ کیا۔؟" موہن نے پوچھا۔

"بڈھا روز رات کے کھانے کے بعد مجھے پیٹتا تھا۔ میں روتی چیختی چلاتی تو وہ گراموفون بجانے لگتا تاکہ میری آواز باجے کی آواز میں دب جائے۔ یہ سلسلہ کوئی ایک یا آدھ گھنٹے تک جاری رہتا۔ جب تک میں رو رو کر تھک نہ جاتی۔ بڈھا چین سے نہ بیٹھتا وہ مجھے رلاتا اور میری آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں کے موتیوں کو ایک ریشمی رومال میں چن لیتا اور پھر اپنی دوکان پر لے جا کر سجا دیتا۔

گاہک موتیوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوتے کیوں کہ کسی جوہری کی دوکان پر ایسے خوب صورت موتی نظر نہ آتے تھے۔ وہ ایسے سفید شفاف اور چمکتے ہوئے موتی تھے کہ سمندر کے موتی ان کے سامنے بالکل جھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر بادشاہ تک پہنچی۔ بادشاہ نے جوہری کے موتیوں کو پرکھا اور دیکھتا رہا۔ اس کو بھی اچھے اچھے موتیوں جواہرات اور دوسرے قیمتی پتھروں کو جمع کرنے کا شوق تھا۔ ہر بادشاہ کو چیزیں جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ کوئی پتھر جمع کرتا ہے۔ کوئی ٹکٹیں جمع کرتا ہے خیر تھوڑی دیر تک موتیوں کو دیکھنے کے بعد بادشاہ نے جوہری سے کہا۔

"یہ موتی تم کہاں سے لاتے ہو۔؟"

جوہری نے دو چار دفعہ جھوٹ بولنے کی کوشش کی مگر بادشاہ بہت چالاک تھا اس نے جوہری سے کہا۔

"سچ سچ بتاؤ یہ موتی کہاں سے حاصل کئے ہیں، ورنہ قتل کروا دیئے جاؤگے، بادشاہ نے جلاد کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔

جوہری تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر اور گڑگڑا کر اپنی جان بخشی کی درخواست کی اور کہا حضور یہ موتی سمندر کے نہیں ہیں۔ یہ موتی ایک ڈبل روٹی بیچنے والی لڑکی کے آنسو ہیں۔

بادشاہ کو یقین نہیں آیا۔ مگر جوہری کے بار بار کہنے پر بادشاہ کو

مانتا تھا۔ اس نے جوہری سے کہا۔ "جاؤ اسے فوراً دربار میں پیش کرو۔
چنانچہ میں دربار میں لائی گئی۔ اور بادشاہ کے سامنے رلائی گئی۔

بادشاہ مجھے رونے دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ واقعی میرے آنسو پلکوں سے گرتے ہی موتی بن جاتے تھے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا بادشاہ کو بھی قیمتی پتھر جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے جوہری کو قتل کرا دیا اور مجھے اپنے محل میں رکھ لیا۔ اور میرے کمرے کے چاروں طرف پہرہ لگا دیا۔

بادشاہ کے محل میں مجھے دن میں ایک بار نہیں، چار چار بار رُلایا جاتا تھا، کیونکہ وہ بادشاہ اپنے قریب کے ایک دوسرے ملک پر چڑھائی کرنا چاہتا تھا۔ اور چڑھائی کے لئے فوج کی اور فوج کے لئے سامان اور روپے کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے میرے آنسو کام میں لائے گئے۔ اور جب بادشاہ کا خزانہ موتیوں سے بھر گیا۔ تو اس نے دوسرے ملک پر چڑھائی کر دی۔ اتفاق کی بات کہ بادشاہ کو بری طرح شکست ہوئی اور دوسرے ملک والوں نے بادشاہ کی راج دھانی پر حملہ کر دیا۔ خوب لوٹ مار ہوئی۔ بادشاہ کا محل بھی لوٹا گیا۔ میں اس لوٹ میں ایک سپاہی کے ہاتھ آئی۔ اس نے مجھے ایک چھوٹی سی لڑکی سمجھ کر دس اشرفیوں کے عوض ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جو

غلاموں کی تجارت کرتا تھا۔ آگے جو کچھ ہوا وہ تم سب جانتے ہو۔"
یوسف نے موہن سے کہا۔ "چلو بھئی، اب آگے بھی بڑھو گے یا کہانیاں سنتے رہو گے۔"

یوسف موہن اور شہزادی تینوں درخت پر چڑھنے لگے۔ یوسف نے موہن سے کہا۔ "میں آگے آگے چلتا ہوں تم میرے پیچھے پیچھے آؤ اور اے مس ڈبل روٹی۔" یوسف نے شہزادی سے کہا۔ "تم ذرا موہن کی مدد کرو۔ بیچارے کے ہاتھ پر صرف ایک انگوٹھا ہے۔ اگر تم مدد نہیں کرو گی تو یہ درخت پر چڑھ نہیں سکے گا۔"

شہزادی کو اپنا نام بہت پسند آیا۔ مس ڈبل روٹی ہنسنے لگی۔ پھر بولی
"موہن بیچارہ بھی کس قدر مجبور ہے۔"

موہن نے غصے سے کہا۔ "میں اس قدر مجبور نہیں ہوں۔ اس درخت پر چڑھتے چڑھتے میرے ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھوں کی انگلیاں اندر ہی اندر پھر سے اُگ رہی ہیں۔"

☆

بہت دیر تک یوسف موہن اور مس ڈبل روٹی درخت کے اوپر چڑھتے رہے۔ یوسف موہن کی ٹارچ سے راستہ دیکھتا جا رہا تھا۔ آخر ایک جگہ پر جاکر یوسف رک گیا۔ درخت کی ایک بہت بڑی شاخ پر ایک بہت بڑا بورڈ لگا تھا۔ اس پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا تھا:

"خبردار۔ اندر قدم نہ رکھنا۔ یہ سانپوں کا شہر ہے۔"

"اوئی۔" شہزادی زور سے چلائی۔ "بھئی مجھے سانپوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

"مجھے بھی۔" موہن بولا۔ "چلو آگے چلو۔"

یوسف نے کہا۔ "نہیں، اندر چلو۔ یہ شہر بھی دیکھ کر جائیں گے۔"

درخت کی شاخ پر چلتے چلتے وہ تینوں شہر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ یوسف کے کھٹکھٹانے پر ایک پہرے دار نے کہا۔

"اگر جان کی امان چاہتے ہو......"

یوسف نے ٹوک کر کہا۔ "ہم نہیں چاہتے۔"

پہرے دار نے کہا۔ "تمہارا بھلا اسی میں ہے کہ لوٹ جاؤ۔"

"آؤ جی۔" یوسف نے موہن اور شہزادی کو ہاتھ سے پکڑا اور دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی پہرے دار نے پہلے تو ان کی اچھی طرح تلاشی لی اور پھر جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

یہ بڑا خوبصورت شہر تھا۔ گلیاں، مکان، بازار، سڑکیں سب کی سب سیمنٹ اور کنکریٹ کی بنی ہوئی۔ صفائی اس قدر تھی کہ کہیں پر ایک تنکا بھی پڑا نظر نہیں آتا تھا۔ لوگ صاف ستھرے کپڑے پہنے گھوم رہے تھے۔ مگر سب خاموش سے، ہراساں، نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ دکانداروں نے دکانوں کے سامنے لوہے کی جالیاں لگا رکھی تھیں۔ اور ان کے پیچھے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گاہک آتا اور سودا طلب کرتا تو لوہے کی ایک چھوٹی سی جھری کھلتی اور دکاندار کا ہاتھ اس میں سے باہر نکلتا۔ سودا دے دیتا۔ پیسے لے لیتا۔ اور پھر یہ لوہے کی جھری کھٹ سے بند ہو جاتی۔ بڑی عجیب بات یہ تھی کہ صرف دکانوں ہی پر لوہے کی جالیاں نہ تھیں بلکہ ہر گھر کے دروازے پر، ہر گلی کے موڑ پر، ہر مکان کی کھڑکی پر لوہے کی جالی تھی۔

"وہ دیکھو، وہ کیا ہے۔" موہن نے اوپر آسمان کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے یوسف سے کہا۔ یوسف نے سر اونچا کر کے دیکھا۔ شہر کے اوپر بھی، سب سے اونچی عمارت کے اوپر، بہت اوپر، ایک لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی۔ یہ لوہے کی جالی سارے شہر کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔

یوسف نے کہا۔ "عجیب شہر ہے یہ۔؟"

شہزادی نے کہا۔ "سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں اتنی دیر ہو گئی اس شہر میں گھومتے ہوئے، ہم نے کہیں پر ایک درخت تک نہیں دیکھا ایک جھاڑ، ایک باغ، ایک پھول، کچھ بھی تو نہیں دیکھا۔"

اب جو یوسف اور موہن نے غور کیا تو انہیں بھی یہ بات بڑی عجیب لگی۔ سچ مچ سارے شہر میں ایک درخت نہ تھا۔ ایک باغ نہ تھا۔ ایک پھول تک نظر نہ آتا تھا۔

"ماجرا کیا ہے۔؟" یوسف نے بڑی حیرت سے کہا۔ اس نے ادھر اُدھر چلتے ہوئے لوگوں سے بھی کئی بار پوچھا۔ مگر کسی نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا۔ بلکہ سوال سنتے ہی لوگ کانپنے لگتے۔ ان کا چہرہ زرد ہو جاتا اور وہ خاموشی سے سر جھکائے آگے بڑھ جاتے۔

"ضرور کوئی بات ہے۔" یوسف نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

موہن نے کہا۔ "چلو یہاں سے بھاگ چلیں۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا شہر یاد آتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں لوگ نہیں تھے، یہاں

لوگ ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔"

یوسف نے کہا۔ "نہیں نہیں اب آئے ہیں تو معلوم کر کے ہی جائیں گے۔"

شام کو یہ تینوں ساتھی تھک کر ایک سرائے میں جا ٹھہرے۔ مگر یہاں بھی ان کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ یوسف کے سوال کرنے پر بھی سرائے والے نے نہ بتایا کہ وہ کیوں ان کی تلاشی لے رہا ہے۔

کمرہ میں پہنچ کر یوسف نے دیکھا کہ لوہے کے پلنگ پر لوہے کے نہایت ہی باریک تاروں کا بنا ہوا بستر لگا ہے۔ تکیہ، چادر، غلاف ہر چیز لوہے کے باریک تاروں سے بنی ہوئی تھی۔ بستر اس انداز کا بنا ہوا تھا کہ آدمی بستر میں گھس کے اوپر سے لوہے کی زِپ لگا کر اطمینان سے اس کے اندر اس طرح سو جاتا تھا جیسے آدمی کسی لوہے کے پنجرے میں سو رہا ہو۔

"عجیب شہر ہے یہ۔"

شہزادی نے کہا۔ "مجھے تو پیاس لگی ہے۔"

یوسف نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ آخر اسے ایک کونے میں پانی کا نل نظر آیا۔ نل کی ٹونٹی پر بھی لوہے کی چھلنی لگی تھی۔ جس میں سے پانی چھن کر آتا تھا۔ شہزادی نے پانی پیا۔ خیر ہوئی کہ پانی لوہے کے باریک تاروں کا بنا ہوا نہیں تھا۔ ورنہ شہزادی کے حلق میں ہی

پھنس جاتا۔

شام کے وقت جیوں ہی سورج غروب ہوا، ان تینوں ساتھیوں نے دیکھا کہ سارے شہر میں سورج کی طرح چمکتی ہوئی ایک نئی روشنی پھیل گئی۔ روشنی اس قدر تیز تھی کہ شہر کا کوئی کونا اس سے محفوظ نہ تھا۔ کہیں پر اندھیرا نہ رہا۔ باہر کی سڑک آئینہ کی طرح چمک رہی تھی۔ اس پر اگر ایک بال بھی پڑا ہوتا تو صاف نظر آجاتا۔

"یہ روشنی کہاں سے آرہی ہے۔؟" یوسف نے پوچھا۔

موہن نے باہر کھڑکی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "وہ دیکھو۔"

"کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔؟ چھت کی طرف دیکھو۔" شہزادی نے کہا۔

وہ تینوں چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ سرائے کی چھت شیشے کی بنی ہوئی تھی۔ اور اس میں سے روشنی چھن کر اندر آرہی تھی۔ روشنی ایک بہت بڑے مینار کے اوپر سے آرہی تھی جس کے اوپر ایک سورج کی طرح چمکنے والا گولا گھوم رہا تھا۔

یوسف نے کہا۔ "اس روشنی میں سوئیں گے کیسے۔؟"

شہزادی نے کہا۔ "بڑی آسان بات ہے۔ اپنے ہاتھ آنکھوں پر رکھو اور سو جاؤ۔"

پھر ان تینوں نے ایسا ہی کیا۔ اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھے اور سو گئے۔ یکایک آدھی رات کے وقت کہیں سے زور کی چیخ بلند ہوئی۔ شہزادی ہڑبڑا کے جاگ اٹھی۔ اس نے موہن کو جگایا۔ موہن نے یوسف کو، یوسف نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے بھئی۔! سونے بھی نہیں دیتے۔؟"

"اٹھو، اٹھو یہ چیخیں سنتے ہو۔؟"

سچ مچ سرائے کے باہر چیخوں کی آواز بڑھتی جارہی تھی۔ اب اس میں عورتوں اور مردوں اور بچوں کے رونے کی آواز بھی شامل ہوگئی تھی۔ یوسف موہن اور شہزادی جلدی جلدی اٹھے اور سرائے کے باہر گئے۔

سرائے کے باہر سڑک پر لوگوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ مگر اس بھیڑ میں ہر شخص رو رہا تھا۔ اور اپنی چھاتی کوٹ رہا تھا۔ آگے آگے کچھ لوگ دس صندوقوں کو اپنے سر پر اٹھائے چل رہے تھے۔ سچ مچ لوگ رو رہے تھے۔

"بھئی ان صندوقوں میں کیا ہے۔؟" یوسف نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"ہش آہستہ بات کر۔ ان صندوقوں میں ان خوش نصیبوں کی

لاشیں ہیں، جنہیں آج رات شری سانپ جی مہاراج نے ڈس لیا ہے۔"

"سانپ نے ڈس لیا ہے۔؟"

"شش۔" اس آدمی نے آہستہ سے کہا۔ "سانپ نہیں، شری سانپ جی مہاراج کہو۔ اگر کہیں انہوں نے سن لیا تو خفا ہو جائیں گے۔"

"کون خفا ہو جائیں گے۔؟"

"شری سانپ جی مہاراج۔ اور پھر مجھے ڈر ہے کہیں وہ تم کو بھی ڈس کر خوش نصیب نہ بنا دیں۔"

"سانپ کے کاٹے سے آدمی خوش نصیب بن جاتا ہے۔؟ وہ تو مر جاتا ہے۔" شہزادی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں مر جاتا ہے، مگر یہاں ہم لوگ اسے خوش نصیب کہتے ہیں کیونکہ اس شہر پر شری سانپ جی مہاراج کا راج ہے۔ اور ہر روز رات کو دس آدمی ان کے کاٹے سے مر جاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے خوش نصیب بن جاتے ہیں۔"

"تو تم اس کم بخت سانپ کو مار کیوں نہیں دیتے۔"

"شش۔ کیا بات کرتے ہو۔" اس آدمی کا رنگ ایک دم پیلا پڑ گیا اور وہ یوسف موہن اور شہزادی کو وہیں چھوڑ کر، بھیڑ میں شامل ہو کر، سر پر خاک ڈالنے اور چیخنے لگا۔

بھیڑ بڑھ رہی تھی۔ لوگ جلوس میں شامل ہو کے روتے دھوتے جاتے تھے۔ کالے صندوق پر کالی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ صندوق بہت بڑے بڑے تھے۔ ایک صندوق کو بارہ آدمی مل کر اٹھاتے تھے، تب کہیں ایک صندوق اٹھتا تھا۔

"کیا یہ صندوق بہت بھاری ہیں۔؟" موہن نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"ہاں ہر صندوق میں مرنے والے کی ساری دولت رکھی ہوئی ہے۔ اشرفیاں، سونا چاندی، ہیرے جواہرات، مکان کا قبالہ۔ زمین کی ملکیت کے کاغذات۔"

"وہ کیوں۔؟"

"یہاں یہ دستور ہے کہ جب کوئی سانپ۔ میرا مطلب ہے۔ شری سانپ جی مہاراج کے کاٹے سے مر جاتا ہے تو سرکاری قانون کی رو سے اسے اس کالے بکس میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور اس کی ساری دولت اس صندوق میں رکھ کر وہ سامنے اونچا مینار جو دیکھتے ہو نا۔ وہاں پہنچا دیتے ہیں۔"

"کیوں۔؟"

"اس مینار کے اندر ہماری سرکار رہتی ہے اور یہ اس کا قانون ہے"

"عجیب قانون ہے! مرنے والے کے بعد اس کی ساری دولت

بھی لے لی جاتی ہے۔؟"

"ہاں۔ مگر شہر کو بچانے کے لئے خرچ بھی تو کتنا ہوتا ہے۔؟" اس آدمی نے کہا۔ "یہ بھی تو سوچو یہ مینار کے اوپر جو روشنی کا گولا ہے، اس کی بجلی پر ہی لاکھوں روپیہ خرچ ہو جاتے ہیں۔ پھر شہر کے اوپر اور چاروں طرف لوہے کے تاروں کا جال لگایا گیا ہے تاکہ سانپ یعنی شری سانپ جی مہاراج اندر نہ گھس سکیں۔ سارے شہر کے درخت بھی کاٹ ڈالے گئے ہیں تاکہ کہیں شری سانپ جی مہاراج کے چھپنے کے لئے جگہ باقی نہ رہے۔ تم نے سارے شہر میں کوئی درخت نہ دیکھا ہوگا۔"

"ہاں، بڑی عجیب بات ہے۔" شہزادی نے کہا۔ "کوئی درخت جھاڑی یا پھول تک نظر نہ آیا۔"

"یہ سب شری سانپ جی مہاراج سے بچنے کے لئے کیا گیا ہے۔ تمام سڑکیں، سارے مکانات، گلیاں، کوچے، بازار، سب پکے بنے ہوئے ہیں۔ تمام نالیاں زمین دوز ہیں اور ان کے منہ پر لوہے کی باریک جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ شہر کی سرکار نے اس آفت سے بچنے کے لئے ہر طرح سے انتظام کر رکھا ہے۔ پھر بھی ہر روز دس آدمی شری سانپ جی مہاراج کے کاٹے سے مر جاتے ہیں۔"

"کیا یہ سانپ کسی کو نظر نہیں آتا۔؟ کیا بات ہے کہ اس قدر روشنی ہوتے ہوئے بھی آپ اس سانپ کو مار نہیں سکتے۔؟" یوسف نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہش، ایسی بات نہ کرو۔ وہ سن لیں گے تو تمہیں بھی ڈس لیں گے۔" اس آدمی کے چہرے پر یکایک زردی پھیل گئی۔ اور وہ بھی بھاگ کھڑا ہوا اور بھیڑ میں جاتے ہی چکرا کر گر پڑا اور زمین پر تڑپنے لگا۔

"کاٹ کھایا۔ مجھے بھی سانپ جی مہاراج نے کاٹ کھایا۔" لوگ زور زور سے چلانے لگے۔ عورتوں نے بال کھول کر، اپنے سروں میں خاک ڈال کر، بین کرنا شروع کر دیا۔ یوسف اور موہن اور شہزادی بھاگ کر اس آدمی کے پاس پہنچے، مگر وہ ان کے آتے آتے ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر سانپ کے ڈنک کا نیلا نشان تھا۔ مگر سانپ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کہاں سے آیا۔ کدھر غائب ہو گیا۔ جلدی سے ایک کالا صندوق لایا گیا اور اس آدمی کی لاش کو بھی اس میں بند کر دیا گیا۔ یکایک ایک زور کی آواز بادل کی طرح گرج کر بولی۔

"ڈرو۔ شہر کے باسیو، شری سانپ جی مہاراج کے قہر سے ڈرو۔ جو کوئی ان کی مخالفت کریگا۔ اسے اس آدمی کی طرح موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔"

"نہیں نہیں، ہم آپ کے تابعدار ہیں۔ غلام ہیں۔" مرد عورتیں بچے سب زمین پر جھک کر گڑگڑانے لگے۔

صرف یوسف، شہزادی اور موہنا کھڑے رہے۔

ایک آدمی نے کہا۔ "جھکو جھکو۔ تم لوگ بھی جھک جاؤ۔"

"واہ ہم کیوں جھکیں۔؟" یوسف نے کہا۔

"ہم کسی کم بخت سانپ کے سامنے نہیں جھکتے۔!"

"ڈرو۔ ڈرو۔" وہ غیبی آواز پھر ادھر سے آئی۔ "شری سانپ جی مہاراج کے قہر سے ڈرو۔"

لوگ زور زور سے رونے لگے اور صندوقوں کو آگے کر کے چلنے لگے۔ جب وہ مینار کے بہت قریب آ گئے تو ایک لوہے کے جنگلے کے پاس آ کے رک گئے۔ یہاں پر لکھا تھا۔

آگے جانا منع ہے

لوگوں نے کالے صندوقوں کو یہیں رکھ دیا۔ اور باادب کھڑے ہو کر مینار کی طرف دیکھنے لگے۔ اونچے مینار کے لوہے کے پھاٹک بند کے بند رہے مگر مینار کے اوپر سے آواز آئی۔ "شہریو، اپنے گھر لوٹ جاؤ۔ ہم ان لاشوں کو بجلی سے جلا دیں گے اور ان کی دولت کو تمہارے فائدے اور آرام کے لئے خرچ کریں گے۔ گھبراؤ نہیں۔ ایک نہ ایک

دن یہ زہر اس شہر سے دور ہوگا۔ ہم ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں کہ تمہیں شری سانپ جی مہاراج نہ ڈسیں۔ اس کے لئے ہر احتیاط عمل میں لائی جاتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ابھی تک ہم اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ شاید خدا کی مرضی ہی ایسی ہے۔ اور شری سانپ جی مہاراج کے زہر میں کس کو دخل ہے۔ جاؤ، میرے بیٹو، واپس جاؤ۔ اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ۔"

موہنا نے پوچھا۔ "یہ کس کی آواز ہے۔؟"

"یہ ہماری سرکار کی آواز ہے۔"

"تو سرکار مینار سے باہر آ کے کیوں بات نہیں کرتی۔؟"

"شری سانپ جی مہاراج کے ڈر سے۔"

"سرکار کی شکل کیسی ہے۔؟"

"سرکار کو کسی نے نہیں دیکھا۔ نہ ان کے آدمیوں کو۔ وہ سب لوگ مینار کے اندر ہی رہتے ہیں۔ اور باہر نہیں آتے۔ ان کی ضرورت کی سب چیزیں یہیں لا کر رکھ دی جاتی ہیں۔"

"جاؤ۔ جاؤ۔ میرے بیٹو۔ فوراً واپس چلے جاؤ۔"

سب لوگ واپس چلے گئے۔ صرف یوسف، موہنا اور شہزادی وہیں کھڑے رہے۔

موہن نے یوسف سے کہا " چلو ہم بھی واپس سرائے میں چلیں "
یوسف نے کہا ۔" میں تو سرکار کی صورت دیکھ کے جاؤنگا ۔"
سرکار کی صورت تو شہر میں آج تک کسی نے نہیں دیکھی تم کیسے دیکھو گے ۔؟"
" میں دیکھنا چاہتا ہوں یہ صندوق اندر کیسے لے جاتے ہیں ۔"
یوسف نے ایک صندوق کھول کر دیکھنا چاہا کہ ایک گرجدار آواز آئی ۔" خبردار جوان صندوقوں کو ہاتھ لگایا ۔ واپس جاؤ ۔ اجنبیو، واپس جاؤ ۔"
شہزادی نے کہا ۔" چلو یوسف یہاں سے بھاگ چلیں ۔ مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے ۔"
" اور مجھے بھی ۔" یوسف نے کہا ۔
یوسف اور موہن اور شہزادی تینوں واپس ہوئے ۔ مگر ایک مکان کی اوٹ پاتے ہی یوسف پھر کھڑا ہو گیا ۔ اور بولا ۔" میں تو یہ تماشہ دیکھ کر ہی واپس جاؤں گا ۔"
"موہن اور شہزادی نے بہت سمجھایا ۔ مگر یوسف نہیں مانا ۔
ایک گھنٹہ تک یوسف اور موہن اور شہزادی مکان کی اوٹ میں کھڑے مینار کی طرف دیکھتے رہے ، مگر کچھ نہ ہوا ۔ مینار کا پھاٹک بند

رہا اور کالے صندوق آہنی جنگلے کے پاس دھرے رہے ۔ آخر ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد یکایک مینار کے اوپر بجلی کے گولے کی روشنی یکایک بجھ گئی اور سارے شہر میں اندھیرا چھا گیا ۔ اور چاروں طرف سے لوگوں کی چیخ و پکار اور ہائے وائے سنائی دینے لگی ۔
یوسف نے شہزادی کا ہاتھ موہن کے ہاتھ میں دے کر کہا ۔
" تم لوگ یہیں کھڑے رہو ۔ میں مینار کے قریب جا کے دیکھتا ہوں کیا بات ہے ۔"
شہزادی نے کہا ۔" مت جاؤ یوسف ، مت جاؤ ۔"
یوسف نے کہا ۔" جانا ضروری ہے ۔ میرا خیال ہے ۔ اس وقت اندھیرا ہے اور وہ لوگ صندوق اٹھا رہے ہوں گے ۔"
موہن نے پوچھا ۔" آخر اس شہر کی سرکار اندھیرے میں کیوں کام کرتی ہے ۔؟"
" اس شہر ہی میں نہیں ، بہت سی جگہوں کی سرکاریں اندھیرے میں کام کرتی ہیں ۔ اور شہریوں کی آنکھ سے اوجھل رہ کر بہت سی باتیں طے کر لیتی ہیں ۔ ہٹو مجھے جانے دو ۔" یوسف نے کہا ۔
چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا ۔ شہریوں کی چیخ و پکاریں بند ہو گئی تھیں ۔ اب چاروں طرف سناٹا تھا ۔ صرف یوسف کے دوڑتے

ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑی دور جاکے یہ چاپ بھی بند ہوگئی۔ پھر تھوڑے وقفے کے بعد ایک زور کی چیخ سنائی دی۔ شہزادی خوف سے موہن کے ساتھ چمٹ گئی۔ یکایک چاروں طرف روشنی ہوگئی۔

شہزادی اور موہن کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ مکان کی اوٹ سے باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ مینار کے سامنے سے کالے صندوق غائب ہیں۔ اور لوہے کے جنگلے کے پاس زمین پر یوسف کی لاش پڑی ہے۔

"ہائے ہائے۔" شہزادی اور موہن روتے روتے یوسف کی لاش کے پاس دوڑے گئے۔ شہزادی نے یوسف کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ یوسف کے ماتھے پر سانپ کے ڈنک کا نیلا نشان موجود تھا۔ شہزادی زار و قطار رونے لگی۔ موہن بھی چیخنے چلانے لگا۔ ان دونوں بچوں کو روتے دیکھ کر ایک بوڑھا ان کے پاس آکر کہنے لگا۔ "کیا بات ہے بچو کیوں روتے ہو۔؟"

"ہمارا ساتھی مر گیا ہے۔ اسے سانپ نے کاٹ کھایا۔"

"سانپ نے کاٹ کھایا۔؟"

بوڑھا مسکرانے لگا۔ اس نے سبز رنگ کی قبا پہن رکھی تھی۔ اس کے

ہاتھ میں ایک لکڑی تھی جس کی موٹھ پر چاندی کے دو پر لگے ہوئے تھے۔ جو ہر وقت پھڑ پھڑاتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لکڑی ابھی ابھی اس بوڑھے کے ہاتھ سے نکل کر خود بخود اڑ جائے گی۔ اس بوڑھے کی داڑھی بڑی لمبی اور نورانی تھی۔ بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔

"بچو تمہارا دوست مرا نہیں ہے، بے ہوش ہے۔"

موہن اور شہزادی نے بوڑھے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بڑی لجاجت سے بولے۔ "بابا، کسی طرح سے ہمارے ساتھی کو اچھا کر دیجئے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "میں اسے اچھا نہیں کر سکتا۔ میں بوڑھا ہوں۔ ہاں تم اسے اچھا کر سکتے ہو۔" اس نے موہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں۔؟" موہن نے پوچھا۔ "وہ کیسے۔؟"

بوڑھے نے کہا۔ "اس سانپ کے کاٹے کی ایک ہی دوا ہے۔"

"وہ کس کے پاس ہے۔؟" موہن نے پوچھا۔

بوڑھے نے کہا۔ "تم دوا ڈھونڈنے جاؤ گے۔؟"

"جاؤں گا۔ اپنے دوست کی جان بچانے کے لئے اگر مجھے اپنی جان بھی دینی پڑے تو جان دے کر دوا لاؤں گا۔"

"شاباش بیٹے۔" بوڑھے نے موہن کی پیٹھ تھپک کر کہا۔ "اب سنو تمہیں کیا کرنا ہے —— تمہیں اس شہر سے باہر نکل کے پھر واپس اپنے درخت پر جانا ہوگا۔"

"جاؤں گا۔"

"وہاں درخت پر ایک میل تک چڑھتے جانا۔ کوئی ایک میل اوپر جا کے ایک بہت بڑی شاخ آئے گی۔"

"بائیں طرف یا دائیں طرف۔؟"

"بائیں طرف۔ اس پر ایک بورڈ لگا ہوگا۔ سوتوں کا شہر۔ تم اس ڈال پہ چلنے لگو گے، تو کوئی دو ڈھائی میل جا کے وہ ڈال ختم ہو جائے گی۔ جہاں ڈال ختم ہو گی وہاں تمہیں ایک غار ملے گا۔ یہ غار سات میل تک ایک پہاڑ کے اندر چلی گئی ہے۔ جب تم اس غار سے نکلو گے تو تم ایک خوب صورت وادی میں پہنچ جاؤ گے۔ سوتوں کا شہر اس وادی میں ہے۔ وہاں شہر کی سب سے بڑی خانقاہ میں تمہیں ایک بڈھا پادری ملے گا۔ جس کے گلے میں ایک صلیب ہوگی۔ اور ایک سنہری زنجیر میں لٹکتا ہوا لعل ہوگا۔ اگر وہ پادری تم کو یہ لعل دے دے تو یوسف کی جان بچ سکتی ہے۔ کیونکہ اس لعل میں یہ خاصیت ہے کہ اگر اسے اس جگہ لگایا جائے جہاں سانپ نے

ڈنک مارا ہے، تو یہ لعل سانپ کا سارا زہر چوس لیتا ہے اور آدمی زندہ ہو جاتا ہے۔ مگر یہ سب کام تین دن میں ہو جانا چاہیئے نہیں تو سانپ کا زہر چلتا چلتا یوسف کے دماغ میں پہنچ جائیگا۔ اور پھر یوسف کسی طرح نہیں بچ سکے گا۔"

"میں ابھی جاتا ہوں۔" موہن نے کہا۔ "مگر یہ یوسف کی لاش؟"

"تم گھبراؤ نہیں۔ تم جاؤ۔ ہم اسے سنبھال لیں گے۔ میں سامنے والے مکان کے تہ خانے میں رہتا ہوں۔ شہزادی میرے پاس رہے گی۔ تم لعل لے کے وہیں آجانا۔"

جب موہن چلا گیا تو بوڑھے نے شہزادی سے کہا۔ "آؤ، گھر چلیں۔"

"مگر یوسف۔؟"

"بوڑھے نے کہا۔ "اسے یہیں پڑا رہنے دو۔ وہ خود بخود اس کی لاش کو اٹھا کر اندر لے جائیں گے۔"

"مگر وہ تو جلا دینگے نا۔!" شہزادی بولی۔

"نہیں۔ تین دن تک نہیں جلائیں گے۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہے۔؟"

"تم میرے ساتھ آؤ۔ سب بتاتا ہوں۔ ہمارا زیادہ دیر تک یہاں کھڑے رہ کر باتیں کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ سرکار سن لے گی تو خفا

ہو جائے گی۔ اور خواہ مخواہ شک ہوگا۔"

بوڑھا شہزادی کو لے کر اپنے تہہ خانے میں چلا گیا۔ وہاں اس نے صندوق سے ایک آئینہ نکالا۔

"یہ کیا ہے۔؟" شہزادی نے پوچھا۔

"یہ جادو کا آئینہ ہے۔ اس میں سب کچھ دکھائی دیتا ہے۔"

بوڑھے نے آئینے کے دو سروں پر لگے ہوئے تار جوڑ دیئے۔

تھوڑی دیر میں آئینے کی سطح پر حرکت پیدا ہوئی۔ جیسے پانی میں کنکر پھینکنے سے حرکت پیدا ہوتی ہے۔ پھر آئینہ ساکن ہو گیا۔

شہزادی نے آئینہ میں دیکھا۔ موہن درخت پر چڑھ رہا ہے۔ پھر اس نے دیکھا مینار کے پھاٹک کھل گئے اور مینار سے چار نقاب پوش باہر نکلے اور یوسف کی لاش کو لے کر اندر چلے گئے۔ پھاٹک بند ہو گیا۔ اب کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

بوڑھے نے آئینہ کا رخ بدلا۔ اب اسے مینار کے اندر کا نظارہ دکھائی دے رہا تھا۔ نقاب پوش یوسف کی لاش کو اٹھا کے ایک عالی شان دربار ہال میں پہنچے۔ وہاں، دربار میں ناچ ہو رہا تھا۔ اور ایک اونچے تخت پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بڑا ہی قیمتی لباس پہنے بیٹھا تھا۔ اس نے نقاب پوش آدمیوں کو اشارہ کیا۔ نقاب پوش یوسف

کی لاش لے کر برف خانے میں چلے گئے۔ برف خانے میں لے جا کے انہوں نے یوسف کے جسم کو رکھ دیا۔ اور برف خانے کو تالا لگا کے واپس چلے گئے۔

"یہ نقاب پوش کون تھے۔؟ وہ تخت پر کون بیٹھا تھا۔؟ وہ لڑکی ناچنے والی کون تھی۔؟" شہزادی نے بوڑھے سے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

بوڑھا مسکرانے لگا۔ اس نے عصا کے پر زور سے پھڑ پھڑائے۔ اس نے آہستہ سے کہا: "بیٹی۔ موہن کو آنے دو پھر سب بتا دوں گا۔"

ادھر موہن جب درخت پر اکیلے چڑھ رہا تھا تو اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں صرف ایک انگوٹھا تھا اور باقی انگلیاں غائب تھیں۔ اس لئے وہ بہت مشکل سے اوپر چڑھ رہا تھا۔ آج اس کی مدد کرنے والا ساتھی بھی اس کے ساتھ نہ تھا۔ آج سب کام اسے خود کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ بڑی دلیری سے اندھیرے ہی میں درخت پر اوپر چڑھتا رہا۔ اس کے ہاتھ چھلنی ہو گئے۔ اس کے انگوٹھوں سے خون نکلنے لگا۔ پھر بھی موہن نے ہمت نہ ہاری اور درخت کے اوپر چڑھتا ہی رہا۔ کئی بار وہ اوپر چڑھ کے نیچے پھسل گیا اور پھر ہمت کر کے اوپر چڑھ گیا۔

جب وہ تیسری شاخ پر پہنچا تو اس کے سارے جسم میں خراشیں آگئی تھیں اور ہاتھ اور پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا جی چاہا کہ وہ واپس لوٹ جائے۔ مگر جب اسے یوسف کی لاش کا خیال آیا۔ تو فوراً اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس نے اپنے دانت بھینچ لئے اور گرتا پڑتا اس بڑی ڈال پر ہو لیا۔ جہاں سے اس بوڑھے کے کہنے کے مطابق سوتوں کے شہر کو راستہ جاتا تھا۔

ایک میل تک اس ڈال پر چلتے چلتے موہن اور بھی تھک گیا۔ اس تھکن کی وجہ سے ایک جگہ سے اس کا پاؤں جو پھسلا تو وہ نیچے لٹک گیا۔ اب اس کا سارا جسم اور ٹانگیں اور پنڈلیاں اور پاؤں کے صرف دو انگوٹھوں سے اس نے درخت کی ایک شاخ کو زور سے پکڑا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس کے انگوٹھوں کی گرفت سے یہ شاخ بھی نکل گئی یا ٹوٹ گئی تو پھر وہ کئی میل نیچے اندھیرے میں جا گرے گا۔ اور پھر شاید اس کی ہڈی پسلی بھی نہیں ملے گی۔

دوبارہ ڈال پر آنے کے لئے اس نے آہستہ سے بندر کی طرح شاخ کو جھلانا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ وہ پینگ بڑھاتا گیا۔ گو اس کی کوشش میں اس کے جسم کی ساری قوت خرچ ہو رہی تھی۔ مگر یہاں زندگی اور موت کا سوال تھا۔ کسی وقت بھی یہ شاخ ٹوٹ سکتی

تھی۔ مگر اس خطرے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے موہن شاخ کو جھلاتا گیا اور پھر ایک ہی جھٹکے میں جست لگا کر اس نے بڑی ڈال کو پکڑنا چاہا۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ وہ بدستور ہوا میں الٹا لٹکتا رہ گیا۔ اب وہ کیا کرے؟ موہن نے اِدھر اُدھر بہتیرے ہاتھ مارے مگر کہیں کوئی شاخ اس کے قابو میں نہ آئی۔ وہ الٹا لٹک رہا تھا۔ اور وقت گزر رہا تھا۔ آخر کار بڑی کوشش سے وہ ہاتھوں اور جسم کو سکوڑ کر اوپر کی طرف گھومتے ہوئے آیا۔ اس کوشش میں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کی ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن پھر بھی موہن نے ہمت نہ ہاری۔ آخر وہ بڑی کوشش سے گھوم کر اور سکڑ کر اور ادھر ہو کر واپس درخت پر سیدھا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

اور اس نے اپنے ہاتھ ڈال پر ٹیک دیئے۔ اس کا سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ پسینہ پونچھنے کے لئے وہ اپنا ہاتھ ماتھے پر لے گیا۔ لیکن وہ چونک پڑا ——— اس کے ماتھے پر انگوٹھے کے بجائے پانچ انگلیوں والا ہاتھ لگا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور وہ خوشی سے چلا اٹھا۔ "آہا میرے ہاتھ پر پانچوں انگلیاں اگ آئیں۔"

اور واقعی اب موہن کے دونوں ہاتھوں پر پانچ پانچ انگلیاں موجود تھیں۔ جیسے سبھی انسانوں کے ہاتھوں پر ہوتی ہیں۔ موہن حیرت

اور خوشی سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ چوم لئے۔ عین اس وقت چاروں طرف ہلکی ہلکی گلابی روشنی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں میں قوت آگئی۔ اور وہ اس روشنی کی مدد سے ڈال پر دوڑتا گیا۔ یہاں بھی وہی گلابی روشنی اسے راستہ دکھا رہی تھی۔ یہ سات میل کا راستہ بھی اس نے دوڑتے ہوئے ہی طے کیا۔

صاحب وہ غار کے دوسری طرف نکلا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہے۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں اور پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک خوب صورت وادی ہے۔

ڈھلان پر بھیڑ بکریاں چر رہی ہیں۔ درخت پھلوں سے، سیب ناشپاتی آڑو اور اناروں سے لدے پھندے ہیں۔ زمین پر گھاس مخمل کی طرح ملائم ہے۔ دھان کے کھیتوں میں پانی چاندی کی طرح چمک رہا ہے اور وادی کے بیچوں بیچ ایک خوب صورت قلعہ کھڑا ہے۔ موہن نے سوچا یہی وہ سوتوں کا شہر ہوگا۔

موہن پہاڑ سے نیچے اترنے لگا۔ راستے میں اسے ایک گڈریا ملا۔ جو بھیڑیں چرا رہا تھا۔ موہن نے اس سے پوچھا۔ "کیوں بھئی نیچے وادی میں یہ قلعہ اور بہت سے مکان نظر آتے ہیں۔ کیا یہی سوتوں کا شہر ہے۔؟"

گڈریے نے آہستہ سے سرگوشی میں کہا۔ "ایں۔ ہاغوں! غوں غو...... ں کیا کہتے ہو۔؟"

موہن نے چلا کر کہا۔ "میں پوچھتا ہوں، سوتوں کا شہر کیا یہی ہے؟"

"آں ہاں۔ یہ.......... ہی...... ہے...... خر۔ خر۔"

گڈریا اپنی بات کہہ کے پھر درخت سے ٹیک لگا کے سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔ موہن نے اپنے دل میں کہا۔ عجیب گڈریا ہے یہ؟

آگے چلا تو کچھ دو چار   کے اس نے دیکھا کہ ایک پہاڑی چشمے کے نیچے ایک عورت گھڑا رکھے بیٹھی ہے۔ قریب جا کے دیکھا تو معلوم

ہوا وہ بیٹھی نہیں ہے۔ بیٹھی بیٹھی سو رہی ہے۔ گھڑا ابھرا ہوا ہے اور عورت گھڑے کو ایک ہاتھ سے تھامے سو رہی ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی ہیں۔ مگر آنکھیں جیسے کسی چیز کو نہیں دیکھ رہی ہیں۔

موہن نے کہا۔ "گھڑا ابھر گیا ہے۔ اٹھو میں پانی پی لوں۔"

"ایں۔؟" عورت نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا۔

موہن چلایا۔ "میں کہتا ہوں گھڑا ابھر چکا ہے۔ اسے پرے ہٹالو۔ میں چشمے سے پانی پیئوں گا۔"

عورت آہستہ سے اٹھی۔ آہستہ سے اس نے گھڑا اٹھایا، اپنے سر پر رکھا اور نیچے گھاٹی کی اور چل دی۔ چلتے چلتے بھی ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ جاگتے ہوئے نہیں، سوتے ہوئے چل رہی تھی۔

موہن آگے بڑھا تو اسے دس جلاہے کھڈیوں پر کام کرتے نظر آئے یہاں بھی وہی حالت تھی۔ تانا بانا چل رہا تھا۔ مگر خواب کی حالت میں جلاہوں کے ہاتھ پاؤں کام کرتے تھے۔ کپڑا بھی بنا جا رہا تھا مگر نیند کی حالت میں۔ موہن نے ایک تانے کے دو تین تاگے توڑ دیئے تو ایک جلاہے نے بغیر کسی غصے کے آہستہ سے کہا۔

"کیوں ـــــ تنگ کر ـــــ تے ـــــ ہو ـــــ سو جا ـــــ ؤ۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جلاہوں نے افیون پی رکھی ہے موہن آگے چلا تو ناشپاتیوں کے ایک جھنڈ کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پکی سنہری خوب صورت ناشپاتیاں جھکی ہوئی شاخوں سے لٹک رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر موہن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے ایک ناشپاتی توڑنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو آواز آئی۔ "ایں کیا کرتے ہو۔؟ مجھے سونے دو نا......؟"

پہلے تو موہن نے سوچا عجیب جگہ ہے۔ یہاں کی ناشپاتی بھی سوتی ہیں اور سوتے سوتے بولتی ہیں۔ پھر اس نے سر گھما کر ادھر اُدھر دیکھا تو اسے ایک درخت کے نیچے مالی آدھا سوتا اور آدھا جاگتا ہوا ملا۔ موہن نے مالی سے پوچھا۔

"خانقاہ کدھر ہے۔؟"

"وہ کیا ہے ـــــ سامنے ـــــ جا ـــــ ؤ ـــــ خر ـــــ خر۔" مالی جواب دے کر پھر سو گیا

خانقاہ کی سیڑھیوں پر پادری کھڑا تھا۔ ہاں وہی پادری تھا جس کا اتا پتہ بوڑھے نے بتایا تھا۔ اس پادری کے گلے میں وہی صلیب لٹک رہی تھی اور وہ لعل، جسے پاکر یوسف کی جان بچ سکتی تھی۔

موہن نے سوچا کم بخت یہ پادری بھی سوتا ہوا معلوم ہوتا ہے

سیدھے اس کی گردن سے لعل اتار کر لے چلو۔ اس سوتوں کی نگری میں کسی سے کچھ مانگنا یا بات کرنا بیکار ہے۔ یہ سوچ کر موہن نے سیدھا اچک کر پادری کے گلے میں پڑے ہوئے لعل کو جھٹکنا چاہا۔ لیکن پادری نے بڑی سختی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"تم کون ہو۔؟ کیا بات ہے۔؟"

موہن نے حیرت سے کہا۔ "ارے تم ——— تم سوئے ہوئے نہیں ہو۔؟"

"نہیں تو۔" پادری نے کڑک کر کہا۔

"معاف کیجئے گا پادری صاحب مجھ سے غلطی ہوئی۔ در اصل راستے میں جتنے آدمی ملے، سب سو رہے تھے۔ میں نے سوچا آپ کو بھی جگانے کی زحمت کیوں لوں۔ اپنا کام کر کے چلتا بنوں۔"

"تمہیں کیا کام ہے میرے بیٹے۔؟" پادری نے بڑی نرمی سے کہا۔

اب موہن نے ساری رام کہانی سنادی اور لعل کی ضرورت بیان کی پھر بڑی منت سماجت سے کہا۔ "دیکھیے پادری صاحب، اگر آپ یہ لعل نہیں دینگے تو میرا دوست مر جائے گا۔"

پادری نے کہا۔ "میں لعل تو دے سکتا ہوں مگر ایک شرط پہ....."

"وہ کیا ہے۔؟"

"تمہیں اس لعل کے بدلے مجھے موتیوں والا شنکھ لا کے دینا ہوگا۔"

"موتیوں والا شنکھ۔؟ کہاں ملے گا۔؟ میرے پاس تو ہے نہیں۔!"

"میں جانتا ہوں وہ تمہارے پاس نہیں ہے۔ مگر تم کوشش کرو تو لا کے دے سکتے ہو۔"

"تو جلدی بتائیے شنکھ کہاں ہے۔؟"

پادری نے ہاتھ پھیلا کے کہا۔ "نیچے وادی میں وہ قلعہ جو ہے نا۔ اس میں سات دیو رہتے ہیں۔ اس وادی پر انہیں دیوؤں کی حکومت ہے۔ ان دیوؤں نے اس وادی کے لوگوں کو سوتے جاگتے کے چکر میں پھنسا رکھا ہے۔ یعنی ساری وادی کو سوتے جاگتے کے چکر میں پھنسا رکھا ہے۔ یعنی ساری وادی کے لوگ نہ اتنے سوئے ہوئے ہیں کہ کوئی کام نہ کر سکیں اور نہ اتنا جاگتے ہیں کہ اپنا برا بھلا سوچ سکیں۔ بس اس حالت میں ان لوگوں کو چھوڑ کر دیو لوگ اپنے قلعہ میں بڑے آرام سے بڑے عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وادی کے تمام لوگ ان کا کام کرتے اور دیو لوگ جو کچھ انہیں دے دیتے ہیں۔ خوشی سے قبول کر لیتے ہیں۔ اور کام کئے جاتے ہیں۔ انہیں معلوم بھی نہیں ہے کہ وہ دیوؤں کے غلام ہیں۔ وہ اب آدمی نہیں رہے، سوتی ہوئی بھیڑیں بن چکے ہیں۔ میں انہیں اس نیند سے جگانا چاہتا ہوں۔"

"مگر اس موتیوں والے شنکھ سے کیا ہوگا۔ ؟"

"جس وقت وہ شنکھ میرے ہاتھ میں آ جائے گا اور میں اسے بجنے کو کہوں گا۔ تو اس کی آواز سنتے ہی یہ ساری وادی اور اس کے سارے لوگ جاگ جائیں گے۔ اس وقت دیوؤں کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ شنکھ کی آواز میں ان لوگوں کے لئے زندگی ہے اور دیوؤں کے لئے موت ہے۔"

"وہ کیسے ؟"

"بس ادھر یہ لوگ جاگنے شروع ہوئے اُدھر دیو مرنے شروع ہوں گے۔ شنکھ کی آواز سنکر دیوؤں کے کان پھٹ جائیں گے۔ ان کے دماغ شق ہو جائیں گے۔ اور وہ مر جائیں گے، اور یہ وادی آزاد ہو جائے گی۔ اسی لئے تو ان دیوؤں نے اس شنکھ کو اس قلعہ میں بڑی حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔ اور دن رات پہرہ دیتے ہیں۔"

"تو پھر میں کیسے اسے حاصل کر سکتا ہوں۔ ؟ میں تو ایک معمولی سا لڑکا ہوں پادری صاحب۔ ؟"

"اگر تم مجھے وہ شنکھ نہیں لا کے دو گے تو میں یہ لعل تمہیں نہیں دونگا۔" پادری یہ کہہ کر خانقاہ کے اندر گھس گیا۔

دن ڈھلتا جا رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی۔ موہن بہت گھبرایا۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اگر اسے لعل ابھی مل جاتا تو وہ ابھی واپس ہو سکتا تھا۔ کل دوسرا دن شروع ہو جائے گا۔ اور بوڑھے نے کہا تھا کہ اگر وہ تین دنوں میں واپس آ گیا تو یوسف کی جان بچ جائے گی ورنہ نہیں۔

بہت سوچ بچار کے بعد موہن نے قلعہ کے اندر گھس کر موتیوں والا شنکھ چرانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ گھاٹی کے نیچے اتر کر شہر کی گلیوں میں گھومتا رہا۔ جب رات کا اندھیرا اچھی طرح سے چاروں طرف پھیل گیا تو اس نے قلعہ کا رخ کیا۔ قلعے کے چاروں طرف ایک گہری خندق تھی جس میں پانی بھرا تھا قلعے کے بڑے پھاٹک کے سامنے ایک لکڑی کا پل تھا۔ جو دیوؤں کی مرضی سے خندق کے آر پار لگایا جا سکتا تھا۔ موہن موقع کا منتظر رہا تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا شہر کے کچھ لوگ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آئے اور خندق کے اس پار آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان لوگوں نے اپنی پیٹھ پر اناج لادا ہوا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں سبزیاں اور پھل تھے کوئی گیہوں لایا تھا۔ اور کوئی چاول۔ جلاہے کپڑا لائے تھے اور گڈریے بھیڑیں اور بکریاں۔ وہ لوگ خندق کے اس پار سارا سامان رکھ کر واپس ہوئے۔ اب وہاں صرف چار آدمی کھڑے تھے۔ دو نوجوان

لڑکیاں اور دو نوجوان لڑکے۔ چاروں بہت خوبصورت تھے۔

موہن نے ان سے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں کھڑے ہو۔؟"

"ہم کو کھا جائے گا۔" ایک لڑکی نے کہا۔

"تم کو کھا جائے گا۔؟" موہن نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" ایک لڑکا بولا۔ "ہم چاروں کو آج دیو لوگ کھا جائیں گے۔"

"اور تم یہ بات لیسے مزے سے آہستہ آہستہ سوتے ہوئے کہہ رہے ہو۔ جیسے تم لوگ دعوت میں جا رہے ہو۔"

"ہاں دعوت ہی تو ہے۔" تیسری لڑکی نے کہا۔

"مگر۔مگر۔ یہ تمہاری زندگی کا سوال ہے۔ تمہیں لڑنا چاہیئے۔"

"دیوؤں سے کون لڑ سکتا ہے۔؟" چوتھے نوجوان نے کہا۔ "یہ تو ہماری قسمت ہے کہ ہمیں کھایا جائے آخر ہم بھی تو بھیڑ بکریاں کھاتے ہیں۔"

"لیکن تم تو بھیڑ بکریاں نہیں ہو، تم انسان ہو۔"

"تو کیا ہوا۔؟" پہلا لڑکا رک رک کر بولا۔ "دیو لوگ کہتے ہیں کہ انسان کا خون پینے میں بہت مزے دار ہوتا ہے۔"

"مگر۔۔۔مگر ۔۔۔۔" موہن اسقدر گھبرا گیا کہ کچھ کہہ نہ سکا۔ یہ چاروں لڑکے لڑکیاں بڑے آرام سے خندق کے کنارے کھڑے اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں قلعے سے ایک لکڑی کا پل نیچے لٹکا اور خندق کے

اوپر بچھ گیا۔ پھر قلعے کے اونچے پھاٹک کھلے اور اندر سے ایک دیو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر آیا۔ موہن اسے دیکھ کر جلدی سے بھیڑوں میں گھس گیا۔ دیو نے آ کے سارے اناج، سبزی پھل، چاروں نوجوان، بھیڑوں اور بکریوں کو اپنی بڑی چادر کے ایک کونے میں باندھ لیا۔ اور اپنے کندھے پر ڈال کر قلعہ کے اندر چلا گیا۔

قلعہ کے اندر جا کر وہ سیدھا باورچی خانہ میں گھس گیا۔ جہاں بڑے بڑے چولہے جل رہے تھے۔ دیو نے اناج کو الگ رکھا سبزی ترکاری کو الگ رکھا۔ بھیڑ بکریوں کو الگ رکھا اور موہن کو اٹھا کے چاروں نوجوانوں کے ساتھ یوں باندھ دیا جیسے رسوئیا۔ ساگ کی ایک گڈی کو دھاگے سے باندھ دیتا ہے۔

"ہا! ہا! آج ہماری رعایا نے چار کے بجائے پانچ انسان ہماری دعوت کے لئے بھیجے ہیں۔" دیو خوشی سے گرجا! اور باقی دیوؤں کو یہ خوشخبری دینے کے لئے چلا گیا۔

جب دیو چلا گیا تو موہن نے باقی ساتھیوں سے کہا۔ "آؤ اس رسی کو توڑ ڈالیں اور باہر بھاگ چلیں۔"

"بھاگ کر کہاں جائیں گے۔؟ اپنی قسمت سے بھاگ کر آدمی کہاں جا سکتا ہے۔" وہ چاروں بولے۔

موہن رسی کو توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں دیو باقی ساتھیوں کو لے کے آگیا۔ یہ ساتوں دیو موہن کو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔ "ہماری رعایا سمجھ دار ہوتی جا رہی ہے۔"

ایک دیو بولا، جس کے سر پر سفید سینگ اُگے تھے۔

"ہاں کل سے آپ انہیں حکم دے دیجئے کہ ہر روز پانچ انسان ہمارے کھانے کے لئے بھیجا کریں۔" سفید سینگ والے دیو نے کالے سینگ والے دیو سے کہا۔ کالے سینگ والے دیو نے باورچی خانے میں کام کرنے والے دیو سے کہا۔ "اب جلدی سے کھانا تیار کر ڈالو اور سب سے پہلے ان کو پکا لو۔"

دیو نے موہن اور دوسرے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا۔" دیو نے رسی کھول دی اور موہن اور دوسرے سب نوجوانوں کو صاف کرنے کے لئے ایک ڈول میں ڈال دیا اور خود چھری لینے کے لئے کچن کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

موہن نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "آؤ یہاں سے بھاگ چلیں۔ موت سر پر منڈلا رہی ہے۔"

"ارے بھائی، ہمیں مرنے دو نا۔ آرام سے سونے دو نا۔" ان چاروں نے بڑے تھکے ہوئے لہجہ میں کہا۔

موہن ہمت کر کے ڈول سے جو اُچھلا تو ایک مچھلی کی طرح تڑپ کر نیچے فرش پر آگیا اور وہاں سے جلدی سے بھاگ کر بڑے بڑے برتنوں کی قطار کے پیچھے سے ہوتا ہوا باورچی خانے کے باہر چلا گیا۔ اور ایک اندھیری سیڑھی کے نیچے جا کے چھپ گیا۔

تھوڑی دیر میں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ دیو اسے ڈھونڈنے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ مختلف کمروں میں سامان اٹھا کے پٹخا جا رہا تھا اور موہن سیڑھی کے نیچے چھپا ہوا اپنی زندگی کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ یکایک سیڑھیوں کے اوپر دو دیوؤں کی گفتگو سنائی دی۔ "آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"سفید سینگ کہاں ہے۔؟"

"وہ شنکھ والے کمرے کے باہر پہرہ دے رہا ہے۔"

"اسے بلا دو نا۔ اس کی ناک تو انسان کو فوراً سونگھ لیتی ہے۔ ذرا سی دیر میں کیا ہو جائے گا۔ شنکھ تو تالے کے اندر ہے۔"

"اچھا بلاتا ہوں۔"

ایک دیو واپس گیا۔ دوسرا سیڑھیوں کے اوپر سفید سینگ کو بلانے گیا۔

موہن جلدی سے قدم اٹھا کے آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اس کا خیال تھا کہ اس موقع پر دیو پلٹ کے نہیں دیکھے گا۔ اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ دیو دھم دھم کرتا ہوا سفید سینگ کے پاس گیا، جو شنکھ والے کمرے کے باہر پہرے دے رہا تھا۔

سفید سینگ والا دیو اس دیو کو دیکھتے ہی بولا۔

"مانس گندھ۔ مانس گندھ۔"

"کہاں ہے مانس گندھ۔؟ دوسرے دیو نے بڑی سختی سے چلا کر کہا۔" اسی لئے تو میں آیا ہوں کہ وہ پانچواں انسان بھاگ گیا ہے۔ تم چل کے اسے تلاش کرو۔"

"مگر یہ شنکھ۔؟"

"یہاں میں پہرہ دیتا ہوں۔"

دیو گھوما۔ موہن بھی اس کے پیچھے پیچھے گھوم گیا۔

سفید سینگ بولا۔ "مجھے تم سے مانس گندھ آتی ہے۔"

"کہاں سے آتی ہے۔؟ میری جیب ٹٹول کے دیکھ لو۔ میں نے کسی انسان کو نہیں چھپا رکھا ہے۔"

سفید سینگ اس کی جیب ٹٹولنے لگا۔ موہن پیچھے سے بھاگ کے شنکھ والے کمرے کے اندر چلا گیا۔

جب سفید سینگ کو کالے سینگ کی جیبوں میں سے کوئی انسان نہ ملا تو اس نے شنکھ والے کمرے کو تالا لگا دیا۔ اور چابی جیب میں رکھ کے دوسرے دیو کو ساتھ لیکے نیچے باورچی خانہ میں چلا گیا ________

ادھر موہن نے دروازہ بند ہوتے دیکھ کر ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے کے چاروں طرف بڑے بڑے پنجرے لٹکے ہوئے تھے، جن میں گانے والے خوش آواز پرندے تھے۔ بلبل مینا۔ طوطے وغیرہ اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے اور راگ سنا رہے تھے۔ کمرے کے بیچ میں ایک بہت بڑی میز پر مخمل کے کپڑے کے اوپر شنکھ جگ، مگ جگ مگ، کر رہا تھا۔ موہن خوشی سے چلایا۔ اور جلدی سے بھاگ کر میز کی طرف گیا۔ اب جان بچ گئی۔ موہن نے سوچا۔ میں اس شنکھ کو اٹھا کر ابھی بجانا شروع کرتا ہوں اور اس کی آواز سے دیو لوگوں کے دماغ پھٹ جائیں گے۔ اور پھر یہ ساری وادی بیدار ہو جائے گی۔

یہ سوچ کر موہن نے شنکھ کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ ایک آواز آئی۔

"خبردار۔"

موہن نے پہلے تو اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے خیال ہوا شاید اسے کسی نے دیکھ لیا ہے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اس نے پھر شنکھ کو ہاتھ لگایا تو پھر آواز آئی۔ "خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔"

موہن بڑا حیران ہوا۔ "اوہو۔ تو آپ بولتے ہیں۔؟"

"ہاں شنکھ کا کام بولنا ہے۔ میں کیوں نہ بولوں۔؟"

"مگر آپ کو تو ———— میرا مطلب ہے لوگ شنکھ کو منہ سے بجاتے ہیں۔ مگر آپ خود بخود بولتے ہیں۔؟"

"ہاں میں خود بخود بولتا ہوں۔"

"تو چلئے۔ میں آپ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھائے لیتا ہوں۔ آپ بولنا شروع کیجئے۔ زور زور سے تاکہ دیوؤں کے کان پھٹ جائیں۔"

"اچھا اٹھاؤ مجھے۔"

"موہن نے شنکھ کو اٹھانے کی کوشش کی مگر شنکھ بہت بھاری تھا۔ موہن سے اٹھایا نہیں گیا۔

"آپ تو بہت بھاری ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔"

"تو آپ یہیں سے چلانا شروع کر دیجئے۔"

"نہیں۔" شنکھ بولا۔ "جب تک کوئی مجھے اٹھا کر اپنے منہ تک نہ لے جائے گا۔ میں نہیں چلا سکتا۔"

"مگر میں آپ کو اٹھا نہیں سکتا۔" موہن بولا۔

"تو میں چلا نہیں سکتا۔"

"آپ بہت بھاری ہیں۔ شنکھ تو اتنا بھاری نہیں ہوتا۔ سیپ کا شنکھ تو بہت ہلکا ہوتا ہے۔" موہن نے کہا۔

"میں کوئی معمولی شنکھ نہیں ہوں۔" شنکھ نے جواب دیا۔ میں لوگوں کو جگانے والا شنکھ ہوں، مجھے اٹھانے کے لئے طاقت چاہیئے۔"

"مگر میں تو ایک معمولی لڑکا ہوں۔" موہن نے اداسی سے کہا۔ "کیا آپ کا وزن کسی طرح سے کم نہیں ہو سکتا۔؟"

"ہو سکتا ہے۔" شنکھ بولا۔ "مگر اس کے لئے تمہیں پھر سے درخت پر جانا ہوگا۔ اور تین میل اوپر چڑھ کر جب ایک بڑی ڈال ....۔"

"بائیں طرف یا دائیں طرف۔؟" موہن نے بات کاٹ کر شنکھ سے پوچھا۔

"دائیں طرف۔ تو اس ڈالی پر تین میل چل کے ایک ہیروں کا جڑا ہوا دروازہ آئے گا۔ دروازہ کے اندر چلے جانا۔ مگر خبردار دروازہ کو ہاتھ نہ لگانا۔ اندر جاؤ گے تو دو سو گز اونچی سیڑھی ملے گی۔ سیڑھی کے اوپر چڑھتے جانا۔ خبردار جو سیڑھی کے دو طرف کی سونے

کی دیواروں کو پھاند لگایا۔ سیڑھی چڑھ کے تمہیں ایک عالی شان کمرہ ملے گا۔ اس کمرے کی ہر چیز سونے کی ہوگی، حتیٰ کہ اس کمرے کے اندر جو آدمی ہوگا اس کا جسم بھی سونے کا ہوگا۔ اس آدمی کے پاس ایک کوا ہے جس کی چونچ میں چاندی کی ڈبیا ہے۔ اس ڈبیا کے اندر گلاب کا ایک پھول ہے۔"

"گلاب کا پھول۔؟"

"ہاں گلاب کا پھول۔ اور اس گلاب کے پھول میں یہ خاصیت ہے کہ یہ پھول کبھی نہیں مرجھاتا۔ ہمیشہ تر و تازہ اور خوشبودار رہتا ہے۔ اگر تم اس آدمی سے وہ گلاب کا پھول لے آؤ اور اس کو مجھ سے چھوا دو تو میں بھی پھول کی طرح ہلکا ہو جاؤں گا۔ پھر تم مجھے اپنے ہاتھ میں اٹھا لینا اور میں ان ظالم دیووں کو مار دوں گا۔"

"ہش۔ وہ دروازہ کھلا۔" شنکھ نے کہا۔

موہن جلدی سے مڑا۔ مگر دروازہ دیو نے کھول لیا تھا۔ اور اس نے موہن کو دیکھ لیا۔ سفید سینگ نے ایک خوشی کی چیخ مار کر موہن کو اپنی مٹھی میں پکڑ لیا۔ وہ اسے اپنی مٹھی میں کچلنے ہی کو تھا کہ شنکھ نے آہستہ سے کہا۔

"دیوجی مہاراج، اس بچے کو چھوڑ دیجئے۔"

"کیوں۔؟"

"یہ آپ کی وادی کا بچہ نہیں ہے۔ یہ باہر سے آیا ہے۔ یہ سوتے انسانوں کا بچہ نہیں ہے۔ یہ جاگتے انسانوں کا بچہ ہے۔ میں اس سے باتیں کروں گا تو میرا دل بہلا رہے گا۔ میرا کہنا مانیئے تو اسے ایک پنجرے میں بند کر کے میرے قریب رکھ دیجئے۔ میرا دل اس سے باتیں کرنے کو چاہتا ہے۔"

"مگر میرا دل اسے کھانے کو چاہتا ہے۔"

"جب میرا جی اس سے باتیں کر کے بھر جائیگا تب آپ اسے کھا لیجئے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" دیو بولا۔

دیو نے موہن کو ایک بڑے پنجرے میں اس طرح بند کر دیا جس طرح لوگ ایک طوطے یا مینا کو پنجرے میں بند کرتے ہیں۔ پھر اسے شنکھ کے سامنے رکھ دیا اور دروازہ بند کر کے تالا لگا کے چلا گیا۔

٭

جب دوسرا دن بھی گزر گیا اور موہن نہیں آیا۔ تو شہزادی بہت پریشان ہوئی اور بوڑھے سے کہنے لگی۔ ذرا جادو کے آئینے میں دیکھو موہن کہاں ہے ۔؟"

بوڑھے نے آئینے کے تار جوڑے آئینے کی سطح پہلے تو بجید گدلی ہوگئی۔ جیسے چاروں طرف سے طوفان چھا رہا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد مطلع خود بخود صاف ہوگیا۔ اب آئینے میں ایک پنجرا لٹکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس پنجرے میں موہن بند تھا۔

"موہن ۔ !" شہزادی زور سے چلائی۔

"موہن نے پنجرے سے ایک ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ "شہزادی مجھے بچاؤ ۔"

شہزادی نے موہن کا ہاتھ پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو ہاتھ لگاتے ہی اندھیرا چھا گیا۔ اور موہن آئینے کی سطح سے غائب

ہوگیا۔

شہزادی مایوس ہوکر بوڑھے کی طرف پلٹی اور رو رو کر بولی۔

"میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں موہن کو کسی طرح بچا لیجئے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "موہن ایک ہی صورت سے بچ سکتا ہے۔"

"وہ کس طرح ۔؟"

"اگر کوئی سوتوں کے شہر کے دیوؤں کو مار دے اور موہن کو پنجرے سے نکال لے۔" بوڑھے نے کہا۔

"ان دیوؤں کے مارنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے ۔؟" شہزادی نے پوچھا۔

"ان دیوؤں کی جان ایک پہاڑی کوے میں ہے اور اس کوے کا پنجرا سوتوں کے شہر سے سو میل دور ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر ایک بہت بڑے قلعے کے اندر لٹکا ہوا ہے۔ اگر کوئی اس کوے کی چونچ میں دبی ہوئی چاندی کی ڈبیا کھول کر اس میں سے گلاب کا پھول نکال لے اور کوے کو مار دے تو سوتوں کے شہر کے سارے دیو مر جائیں گے۔ پھر اگر گلاب کے پھول کو موتیوں کے شنکھ کے اوپر رکھ دیا جائے گا تو موہن کا پنجرا خود بخود کھل جائے گا۔ اور موتیوں والا شنکھ گلاب کے پھول کی طرح ہلکا ہوجائے گا پھر وہ شنکھ آسانی سے اٹھا کر پادری

کو دیا جا سکتا ہے اور جلد ہی اسے اس کے گلے کا لعل دے کر یوسف کی جان بچائی جا سکتی ہے۔"

شہزادی رونے لگی اور بولی۔ "یہ سب کچھ ایک دن میں تو کیا ایک ہفتہ میں بھی نہیں ہو سکتا۔"

بوڑھے نے اسے ہمت دلائی اور بولا۔ "اگر تو کوئی شہزادی ہے تو واقعی اس کام کو نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر تو ڈبل روٹی والے کی لڑکی ہے تو اس کام کو ضرور کر سکتی ہے۔"

شہزادی بولی۔ "میں سچ مچ ڈبل روٹی والے کی لڑکی ہوں۔"

"تو میرا یہ عصا لے جا۔" بوڑھے نے اپنا پروں والا عصا اسکے ہاتھ میں دے کر کہا۔ "اس وقت پیدل چلنے سے کام نہ ہوگا۔ اس عصا پر گھوڑے کی طرح سواری کی جا سکتی ہے۔ جتنی دیر تک تو اس کے پروں پہ ہاتھ رکھے رہے گی، یہ عصا ہوا میں اڑتا چلا جائے گا۔ جب اس کے پروں پر سے ہاتھ اٹھائے گی تو یہ عصا خود بخود ہوا میں اڑنا بند کر دے گا۔ اور زمین پر اتر آئیگا۔"

شہزادی نے عصا پر سوار ہو کر کہا۔ "چل مجھے پہاڑی کوے کے پنجرے کے پاس لے چل۔"

اتنا سنتے ہی عصا کے پر زور زور سے پھڑپھڑانے لگے۔ چند

لمحوں کے بعد شہزادی ہوا میں اڑی چلی جا رہی تھی۔ الٹے درخت کی شاخیں میلوں تک اس کی نگاہ کے نیچے پھیلتی جا رہی تھیں۔ کچھ عرصے کے بعد عصا ایک طرف کو مڑ گیا۔ اب عصا ایک گہری غار میں سے گزر رہا تھا۔ شہزادی کو بہت ڈر لگا۔ مگر وہ بڑی مضبوطی سے عصا کے پروں پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔

تھوڑی دیر کے بعد عصا سوتوں کے شہر کی وادی کے اوپر اڑ رہا تھا۔ اوپر اور اوپر، عصا بادلوں میں غائب ہو گیا۔ اب چاروں طرف دھند ہی دھند تھی۔ بادل ادھر ادھر آتے جاتے، ارنے بھینسوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے۔ بجلی کی کڑک پیدا ہوتی۔ بادل گرجنے لگتے۔ شہزادی کے سارے کپڑے پانی میں شرابور ہو گئے۔ مگر شہزادی بہت ہی مضبوطی سے عصا کے پروں پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ آخر عصا بادلوں سے بھی اونچا اڑنے لگا۔

پھر شہزادی نے دیکھا کہ بادلوں سے بھی اونچا ایک پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ پر نہ کہیں کوئی درخت ہے، نہ گھاس ہے۔ نہ جھاڑیاں ہیں چاروں طرف برف ہی برف پڑی ہے! اور بڑی بڑی چٹانوں کے اوپر کہیں کہیں آدمیوں کی ہڈیاں اور پنجر بکھرے پڑے ہیں۔ اور یہ پنجر پہاڑ کی ڈھلانوں سے لے کر اس کی چوٹی تک بکھرے پڑے تھے۔

عصا اب پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھ رہا تھا۔
پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پہاڑ کی چوٹی پر ایک خوب صورت قلعہ تھا جو قدرے سونے کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا تھا۔ جب شہزادی قلعے کے قریب پہنچی تو اس نے دیکھا کہ واقعی قلعہ سونے کا بنا ہوا ہے۔ اینٹیں، دیواریں اور دروازے، سیڑھیاں، کھڑکیاں، ہر چیز سونے کی بنی ہوئی تھی۔

سب سے اونچے برج پر سنہری تار کے پردے سرسرا رہے تھے۔

اس برج کی چھت سے ایک طلائی زنجیر لٹک رہی تھی۔ اس زنجیر سے ایک پنجرا لٹک رہا تھا۔ اس پنجرے میں ایک کوا اپنی چونچ میں چاندی کی ایک چھوٹی سی ڈبیا دبائے بیٹھا تھا۔ برج کے فرش پر چاروں طرف خوفناک شیر مونہہ کھولے بیٹھے تھے۔ شہزادی کو دیکھ کر دہاڑنے لگے۔

شہزادی نے ڈرتے ہوئے کہا۔ "عصا اوپر اڑو۔"

عصا قلعے کے بالکل اوپر اڑنے لگا۔

شہزادی کچھ سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد شہزادی نے عصا سے کہا۔ "مجھے قلعے کے دروازے پر لے چلو۔"

عصا چکر کاٹتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ جب وہ قلعے کے دروازے پر پہنچا تو شہزادی نے پروں پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ عصا ایک دم قلعے

کی سیڑھیوں پر رک گیا۔ اور شہزادی ٹھوکر کھاتے کھاتے بچی۔ عصا کو ہاتھ میں لئے شہزادی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی قلعے کے دروازے پر آئی۔ اس نے دیکھا کہ دروازہ بالکل کھلا تھا۔

شہزادی قلعے کے اندر داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کہیں کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔

"کوئی ہے؟ کوئی ہے۔؟" شہزادی کی آواز گنبد سے ٹکرا کے واپس آئی۔ پھر چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

شہزادی ڈرتے ڈرتے آگے بڑھی۔ بڑے ہال سے گزر کر اونچی سیڑھیوں کی ایک اور لمبی قطار آتی تھی جس کے اوپر بہت سے الناؤن کے نیچے پڑے تھے۔ شہزادی یہ سیڑھیاں بھی چڑھ گئی۔ سیڑھیوں کے اوپر کا دروازہ بند تھا۔ شہزادی نے ہاتھ سے زور لگا کے دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اس کی اسی کوشش میں اچانک شہزادی کا عصا دروازے سے چھو گیا۔ عصا کے چھوتے ہی دروازہ 'چررر' کر کے خود بخود کھلنے لگا۔

شہزادی آہستہ آہستہ اندر داخل ہوئی۔ یہ ایک بہت بڑا عالی شان کمرہ تھا۔ چھت پر ہیرے جواہرات کے فانوس لٹک رہے تھے۔ سونے کی دیواروں میں خوشنما کٹی ہوئی باریک سونے کی

جالیاں تھیں۔ ان سے دھیمی دھیمی روشنی چھن چھن کے آرہی تھی شہزادی کے قدم ایک بہت ہی خوب صورت دروازے پر آکے رک گئے جو سالم نیلم کا بنا ہوا تھا۔ شہزادی نے دیکھا کہ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

شہزادی نے چلا کے کہا۔ "کوئی ہے۔؟"

"کوئی ہے۔؟ کوئی ہے۔؟" شہزادی کی آواز گنبد سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد چاروں طرف سے قہقہوں کی آواز آنے لگی۔ "ہاہاہا کس کو ڈھونڈتی ہو۔ ہاہاہا۔ کوئی ہے۔؟ ارے بھئی یہاں سب کوئی ہیں۔ تم کس کو ڈھونڈتی ہو۔؟ ہاہاہا۔ اندر آجاؤ۔"

شہزادی ڈرتے ڈرتے دروازے کے اندر داخل ہوئی۔

اس کمرے میں ایک پورا درخت سونے کا بنا ہوا تھا۔ اس کی شاخوں میں جواہرات جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ سونے کی دیواروں میں جالے لگے تھے، مگر وہ بھی سونے کے تھے۔ زمین پر مٹی پڑی تھی۔ میز کرسیاں گلدان ہر چیز سونے کی تھی۔ مگر گرد سے اٹی پڑی تھی۔ شہزادی نے ہاتھ لگا کے دیکھا۔ یہ گرد بھی سونے کی تھی۔

ایک سنہرے بستر پر ایک لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال سنہری رخسار سنہری، ہونٹوں کی چمک سنہری۔ سرتاپا سونے کی مورت معلوم

ہوتی تھی۔ وہ چپ چاپ سوئی پڑی تھی۔

شہزادی نے اسے جگانا چاہا۔ مگر جب اسے جھنجھوڑنے کے لئے ہاتھ لگایا تو اسے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ لڑکی ساری کی ساری سونے کی تھی۔ اس لڑکی کے بستر کے قریب ہی ایک آرام کرسی پڑی تھی۔ اس پر ایک بڈھا آدمی لیٹا تھا۔ شہزادی نے چلا کے کہا۔

"باپو۔!"

مگر نہیں، یہ اس کا باپ نہیں تھا گو پہلے پہل اسے اپنا باپ معلوم ہوا۔

شہزادی نے ایک قدم آگے بڑھایا تو اسے یہ بڈھا جوہری معلوم ہوا۔

"جوہری۔؟" شہزادی چلائی اور پیچھے ہٹی، کیوں کہ اب اسے اس بڈھے کے چہرے میں اپنا نیلام کرنے والے ظالم آدمی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

"ظالم! ظالم!" شہزادی ڈر کے مارے پیچھے ہٹ کے چیخی۔

"گھبراؤ نہیں۔" کسی نے قریب سے ہنس کے کہا۔ "یہ آدمی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہ تو سارے کا سارا سونے کا بنا ہوا ہے۔"

شہزادی نے پلٹ کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر اسے کہیں پر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔

شہزادی نے پلٹ کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر اسے کہیں پر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔

شہزادی نے چلا کے کہا۔ "تم کون ہو۔؟ کہاں چھپے کھڑے ہو۔؟ سامنے آکے بات کرو۔"

"میں یہاں تمہارے سامنے تو بیٹھا ہوں۔"

"کہاں۔؟" شہزادی نے فوراً پوچھا۔

"یہاں۔ تمہارے سامنے،" آواز آئی۔

مگر شہزادی کے سامنے تو کچھ بھی نہیں تھا۔ بس اس کے قریب ہی ایک طلائی تپائی پر ایک ستار رکھا تھا۔ جس کے تار خود بخود ہلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"کیا تم بولتے ہو۔؟" شہزادی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں میں ہی بولنے والا ستار ہوں۔" ستار نے جھنجلا کر کہا۔

"تو یہ سب ماجرا کیا ہے بھائی۔؟"

ستار نے ہنس کر کہا: "ستار کبھی بھائی ہو سکتا ہے۔ میں تو ایک بے جان ستار ہوں۔"

"مگر یہ لڑکی کون ہے۔؟" شہزادی نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ لڑکی اس بڈھے کی بیٹی ہے۔"

"یہ تو سونے کی ہے۔! اس کو کیا ہوا۔؟"

"اس قلعے کے اندر کی ہر چیز سونے کی ہے۔ مرغیاں سونے کی ہیں اور سونے کے انڈے دیتی ہیں۔ فوارے سونے کے ہیں اور سونے کا پانی اچھالتے ہیں۔ درخت، پھول، پھل، پتے۔ یہاں ہر چیز سونے کی ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر تم اس کمرے کے اندر روٹی پکاؤ گی تو وہ بھی توے پر تپ کر سونے کی ہو جائے گی۔"

"ایسا کیوں ہے۔؟" شہزادی نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"یہ بڈھا جو کرسی پر پڑا ہے نا۔" ستار نے کہا۔ "اپنے زمانہ کا بہت بڑا ظالم تھا۔ پارس پتھر اسی کی ایجاد ہے۔"

"پارس پتھر کیا ہوتا ہے۔؟" شہزادی نے جلدی سے پوچھا۔

"اس بڈھے کے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی میں سونے کی انگوٹھی کے اندر جو نگ تم دیکھتی ہو نا، یہی پارس پتھر ہے۔ یہ پتھر جس چیز کو چھو لے وہی سونے کی ہو جاتی ہے۔"

شہزادی آگے بڑھی۔ ستار نے چلا کے کہا۔ "ہاتھ لگاؤ گی تو سونے کی ہو جاؤ گی۔"

شہزادی پیچھے ہٹ گئی اور بولی۔ "مگر یہ آدمی زندہ ہے، اس کا دل حرکت کر رہا ہے۔"

"ہاں۔" ستار نے کہا۔ "اس کا سارا جسم سونے کا ہو چکا ہے۔ مگر دل چونکہ سونے کا نہیں ہوا، اس لئے یہ آدمی ابھی تک زندہ ہے۔"

"اس کا دل کیوں سونے کا نہیں ہوا۔؟" شہزادی نے پھر سوال کیا۔

"پہلے پہلے تو اسے سونے سے بڑی محبت تھی۔ ہر چیز کو ہاتھ سے چھو کر اسے سونا کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ میں بھی کسی زمانے میں معمولی لکڑی کا ستار تھا۔ اب سونے کا ہوں۔ اور بہت بھاری ہو گیا ہوں۔ باتیں کرتے کرتے تار دکھنے لگتے ہیں۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔؟"

"تم یہی کہہ رہے تھے کہ یہ آدمی بڑا ظالم تھا اور اپنے پارس پتھر سے ہر چیز کو سونا کر دیا کرتا تھا۔"

"ہاں لیکن ایک دن جب اس نے غلطی سے اپنی بیٹی کو اپنے پارس پتھر سے چھو لیا اور اس کی بیٹی سونے کی ہو گئی تو اس آدمی کو سونے سے نفرت ہو گئی۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ سونے کی بنی ہوئی بیٹی پھر سے زندہ گوشت پوست کی لڑکی بن جائے۔ مگر اسے کامیابی نہ ہوئی کیونکہ کسی چیز کو سونے میں تبدیل کرنا آسان ہے، مگر سونے کو گوشت

میں تبدیل کرنا بالکل ناممکن ہے۔ چنانچہ جب یہ اپنی بیٹی کو دوبارہ زندہ کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے اپنے آپ کو بھی پارس پتھر سے چھو لیا اور سونا ہو گیا۔ مگر چونکہ اس کے دل میں سونے سے نفرت پیدا ہو چکی تھی، اس لئے اس کا دل ابھی تک اندر سے گوشت کا ہے۔ اور ہر دم دھڑکتا ہے۔ ہاں اب تم تو بتاؤ کہ تم کیوں یہاں آئی ہو۔ کیا پارس پتھر کی تلاش میں۔؟ راستے میں کیا ہزاروں لالچی آدمیوں کے پنجر نہیں دیکھے جو اسی پارس پتھر کی تلاش میں چل کر یہاں پہنچے اور اس کوشش میں مر گئے۔"

"دیکھے ہیں۔؟" شہزادی نے کہا۔ "مگر مجھے تمہارا پارس پتھر نہیں چاہیئے مجھے پہاڑی کوا چاہیئے۔"

"پہاڑی کوے پہ تو شیروں کا پہرہ ہے۔ اور یہ شیر صرف اس بڈھے کا کہا مانتے ہیں۔ جو اس کرسی پر تمہارے سامنے بے ہوش لیٹا ہے۔ پہاڑی کوے کو پکڑنے کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ بس ایک صورت ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا۔؟" شہزادی نے جلدی سے کہا۔

"یہاں آس پاس کہیں سے تم پانی لا سکتی ہو؟"

"پانی۔ پانی کی پہاڑوں پر کیا کمی ہو سکتی ہے۔" شہزادی بولی۔

میں نے راستے میں چٹانوں پر چاروں طرف برف ہی برف دیکھی ہے۔"

"بے وقوف، وہ تو سونے کی برف ہے۔ اس پہاڑ پر جتنے چشمے ہیں وہ سب سونے کے ہیں۔ ان میں پانی کے بجائے سونا پگھل کر بہتا ہے۔ اس پہاڑ پر سب کچھ ہے۔ مگر پانی نہیں ہے۔"

"پانی کو لے کر کیا کرو گے۔؟"

"اگر تم کہیں سے پانی لے آؤ۔ بس سادہ پانی، اور اسے اس آدمی پر اور اس کی بیٹی پر چھڑک دو تو یہ دونوں پھر سے زندہ ہو جائیں گے۔ اپنے سونے کے جسم کو چھوڑ کر پھر سے گوشت پوست کے انسان بن جائیں گے۔ پھر تم اس بڈھے سے پہاڑی کوّا مانگ سکتی ہو۔ کیونکہ تم اس کی جان بچاؤ گی۔ اس لئے یہ تمہیں پہاڑی کوّا ضرور دیگا۔"

"تم کیوں اس بڈھے کی اتنی طرف داری کرتے ہو۔؟" شہزادی بولی۔

"اس لئے کہ یہ اپنی غلطی تسلیم کر چکا ہے۔ اسے کافی سزا مل چکی ہے اور میں ایک رحم دل ستار ہوں۔ اور میں پھر سے گانا چاہتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا جب میں لکڑی کا ستار تھا۔ اور یہ خوب صورت لڑکی اپنی پیاری پیاری انگلیاں میرے سینے پر پھیر کے ایسے ایسے خوب صورت راگ گایا کرتی تھی کہ کیا بتاؤں۔ میں ان دنوں کو پھر سے واپس لانا چاہتا ہوں جب

میرے سینے سے نغمے پھوٹ کر نکلتے تھے۔ اب میں بول سکتا ہوں، گا نہیں سکتا۔"

"گا کیوں نہیں سکتے۔؟"

"گانے کے لئے خوب صورت انگلیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کی زندہ انگلیوں کی۔ اور اس زندگی کے لئے سونے کی نہیں، صرف سادہ پانی کی ضرورت ہے۔ کیا تم کہیں سے پانی نہیں لا سکتیں۔؟ اگر تم پانی لے آؤ تو میں تمہیں اس کے بدلے پارس پتھر، سونے کے ابلتے ہوئے چشمے، سونے کی مرغی، یہ سارا سونے کا قلعہ دے سکتا ہوں۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔" شہزادی بولی۔ "میں صرف پہاڑی کوّا چاہتی ہوں۔"

شہزادی عصا پر سوار ہو گئی اور اس کے پروں پر ہاتھ رکھ کے بولی: "جلدی سے کسی سادہ پانی کے چشمہ پر لے چلو۔"

عصا کے پر پھڑپھڑائے۔ چند لمحوں میں عصا پھر سے ہوا میں پرواز کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس طلائی پہاڑ کی گھاٹیوں سے نیچے پھسلتا چلا گیا۔ پھر اندھیرے میں سفر کرنے لگا۔ پھر گھوم گھوم کر بادلوں میں چکر کھاتا ہوا یکایک ایک سرسبز و شاداب وادی میں

جا گرا۔ جہاں لانبی گھاس اُگی تھی اور گھاٹیوں پر سبز پوش درخت کھڑے تھے اور دو چٹانوں کو چیر کر ایک خوب صورت آبشار نیچے وادی میں گر رہا تھا۔

اس آبشار کے نیچے بہت سی عورتیں گھڑوں میں پانی بھر رہی تھیں۔ شہزادی نے جلدی سے پانی کی بھری ہوئی ایک گھڑیا اٹھائی اور پیشتر اس کے کہ گھڑیا کی مالک عورت چلا سکتی۔ وہ عصا پر سوار ہو کے اڑ گئی۔ عورتیں حیرت سے دیکھنے لگیں۔ بلکہ کئی ایک غش کھا کے گر پڑیں۔ شہزادی عصا پر سوار ہو کر واپس قلعے میں پہنچی۔ راستے میں جہاں جہاں وہ انسانی پنجروں پر پانی چھڑکتی گئی، وہاں وہاں مردے زندہ ہو کر اس کا شکریہ ادا کرنے لگے۔

قلعے کے اندر پہنچ کر اس نے سب سے پہلے بوڑھے پر پانی چھڑکا۔ بڈھا پھر سے گوشت پوست کا بن گیا۔ شہزادی نے پھر جلدی سے بڈھے کی خوب صورت بیٹی پر پانی چھڑکا۔ وہ بھی زندہ ہو گئی اور اپنے باپ سے بغلگیر ہونے کے لیے آگے بڑھی۔ لیکن عین اسی وقت کسی نے زور سے کہا۔

"خبردار آگے نہ بڑھنا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک پارس پتھری ہے۔" یہ ستار بول رہا تھا۔

بڈھے نے جلدی سے اپنے ہاتھ سے پارس پتھر کی انگوٹھی اتار کے قلعے کے باہر پھینک دی اور دونوں ہاتھ بڑھائے اپنی بیٹی سے بغلگیر ہوا۔ باپ بیٹی دونوں نے شہزادی کا شکریہ ادا کیا، اور جب شہزادی نے اپنا مطلب ظاہر کیا تو بڈھے نے بڑی خوشی سے اس کی درخواست قبول کر لی۔ وہ خود اوپر کے برج میں جا کے اپنے سدھائے ہوئے شیروں کے بیچ میں سے پہاڑی کوّے کا پنجرہ اٹھا لانے کے لئے روانہ ہوا۔ عین اسی وقت پھر کسی نے کہا۔ "اور ابھی یہیں چھوڑے جانے لگے۔ یہ سچ ہے انسان بڑا ناشکرا ہوتا ہے۔"

شہزادی نے پلٹ کر ستار کی طرف دیکھا اور پھر اس پر بھی پانی چھڑک دیا۔ سونے کا ستار پھر سے لکڑی کا ستار بن گیا۔ اور بڈھے کی بیٹی نے اپنے ستار کو پہچان کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور ستار کے تاروں پر بہنے لگے اور پھر ان تاروں سے ایسا خوب صورت راگ نکلنے لگا کہ قلعے کا ہر درخت پھر سے شاداب ہو گیا۔ اور جہاں سونے کے پتے تھے وہاں ہری ہری پتیاں نکل آئیں۔ اور جہاں سونے کے پھول تھے۔ وہاں نازک پنکھڑیاں والے پھول مہک اٹھے۔ اور جہاں ننگی چٹانیں تھیں وہاں گھاس نکل آئی۔ اور جہاں سونے کے تپتے ہوئے

چشمے ابلتے تھے وہاں ٹھنڈا میٹھا پانی کل کل کرتا ہوا زمینوں کو سیراب کرنے لگا۔

سونے کی وادی میں پھر سے بہار آگئی۔

اوپر کے برج میں جاکر بڈھے نے اس ہرے بھرے منظر کو دیکھ کر شہزادی سے کہا۔ "ہاں تم اب پہاڑی کوّا لے جا سکتی ہو۔"

"اس پہاڑی کوّے میں اور کیا خاص بات ہے۔؟"

"اس پہاڑی کوے کی آنکھوں میں پتلیوں کی بجائے پارس پتھر ہے اس کوّے کے مرجانے کے بعد پارس پتھر دنیا سے ناپید ہو جائیگا۔"

بڈھے نے طلائی زنجیر سے پنجرہ کھول کر شہزادی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

شہزادی عصا پر سوار ہو کر چند لمحوں میں سوتوں کے شہر میں پہنچ گئی۔ عصا دیوؤں کے قلعے کی اونچی اونچی دیواروں کے اوپر سے اڑتا ہوا سیدھا قلعے کے اندر جا اترا۔ قلعے کے اندر پہنچتے ہی دیو "مانس گند۔ مانس گند۔" کہتے ہوئے چیختے چلاتے شہزادی کی طرف بڑھے۔

شہزادی نے جلدی سے پنجرا کھول کے کوے کی چونچ سے چاند کی ڈبیا نکال کے اپنے پاس رکھ لی اور کوے کے دونوں پر نوچ کر

پھینک دیئے۔

پروں کا نوچنا تھا کہ دیوؤں کے دونوں بازو کٹ کے الگ گر پڑے۔ زور سے چلاتے ہوئے، خوفناک دہاڑیں مارتے ہوئے وہ شہزادی کی طرف لپکے۔ شہزادی نے کوّے کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں۔ پہاڑی کوّے کی آنکھیں پھوٹتے ہی دیو بالکل اندھے ہو گئے۔ اب انہیں شہزادی نظر نہ آتی تھی۔ اور وہ تاریکی میں ادھر اُدھر پاگلوں کی طرح دوڑنے لگے۔

ایک دیو جس کے نتھنوں میں آدمی کو سونگھنے کی قوت سب سے زیادہ تھی گرتا پڑتا کسی نہ کسی طرح شہزادی کے قریب پہنچ گیا۔ شہزادی کے قریب پہنچ کے اس نے اپنا پاؤں شہزادی کے جسم کے اوپر رکھنا چاہا۔ مگر اس وقت شہزادی نے بڑی پھرتی سے کام لیا، اور جلدی سے پلٹ کر گھوم گئی۔ اس نے جلدی سے کوے کو ٹانگوں سے پکڑا اور اسے بیچ سے چیر ڈالا۔ کوّے کو چیرتے ہی چاروں طرف سے بادلوں کی سی کڑک اور گرج پیدا ہوئی۔ زمین ایسے کانپ اٹھی جیسے بھونچال آگیا ہو۔

قلعے کے برج ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑے اور شہزادی بھی زلزلے کے دھکے سے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب اسے ہوش آیا تو کیا دیکھتی ہے کہ وہ

قلعہ ہے نہ وہ دیو۔ نہ وہ بُرج ہیں اور نہ خندق۔ ایک سرسبز و کشادہ میدان ہے جس میں مخمل کی طرح نرم و ملائم گھاس غالیچے کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ اور رنگا رنگ کے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ اس میدان کے بیچ میں ایک میز بچھی ہے اور اس میز پر وہ موتیوں والا شنکھ رکھا ہے۔ اور اس کے قریب ایک پنجرا پڑا ہے جس میں موہن بند ہے۔

موہن کو دیکھتے ہی شہزادی بے اختیار اس کی طرف دوڑی اور جلدی سے پنجرا کھول کے اسے آزاد کیا۔

پھر اس نے چاندی کی ڈبیا سے گلاب کا پھول نکالا اور اسے شنکھ پر رکھ دیا۔

شنکھ پر رکھتے ہی گلاب کا پھول غائب ہو گیا اور شنکھ پھول کی طرح ہلکا ہو گیا۔ موہن نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور گھوڑا پر سوار ہو کے وہ دونوں پادری کے پاس چلے گئے اور اس کے ہاتھ میں شنکھ دے دیا۔

پادری شنکھ کر دیکھ کے بہت خوش ہوا۔ اس نے شنکھ سے کہا۔

"اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو۔"

مگر شنکھ خاموش رہا۔

پادری نے غصے سے موہن کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تم نے مجھ سے

دھوکا کیا ہے۔ یہ اصلی موتیوں والا شنکھ نہیں ہے۔ تم کوئی دوسرا جعلی شنکھ اٹھا لائے ہو۔"

موہن نے کہا۔ "نہیں وہی شنکھ ہے۔"

"تو پھر یہ بولتا کیوں نہیں۔؟" پادری نے پوچھا۔

موہن نے شنکھ کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ بالکل وہی شنکھ تھا۔ اس نے شنکھ سے پوچھا۔ "تم بولتے کیوں نہیں۔؟"

مگر شنکھ پھر بھی نہ بولا۔

پادری نے غصے سے کہا۔ "جاؤ تمہیں لعل نہیں ملے گا۔"

شہزادی نے شنکھ موہن کے ہاتھ سے چھین کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اور پھر زور سے شنکھ کو پھونکا۔

یکایک شنکھ زور زور سے گانے لگا۔

"اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو"

اس کی آواز ساری وادی میں گونج اٹھی اور جہاں جہاں لوگ سوئے پڑے تھے، یا نیم غنودگی میں تھے۔ یا نیم بیدار تھے۔ وہاں وہاں سب لوگ یہ آواز سنکر جاگتے گئے۔ خوشی کے مارے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آج برسوں کے بعد وہ جاگے تھے اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کو پہچان رہے تھے اور ان کے گلے مل رہے تھے۔ ساری

وادی میں بہار آگئی تھی۔ اور شنکھ زور زور سے گا رہا تھا۔

"اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو"

پادری نے خوشی سے شنکھ کو کلیجے سے لگا لیا۔ اور بولا۔ "میں سمجھ گیا اب یہ دیوؤں کا شنکھ نہیں ہے۔ یہ انسان کا شنکھ ہے۔ یہ خود نہیں بولے گا۔ اس میں انسان کا سانس اور اس کی محنت بولے گی۔"

پادری نے موہن اور شہزادی کی طرف دیکھا اور گردن جھکا کے اپنے گلے کا لعل اتار کے، ان کے حوالے کر دیا۔ شہزادی اور موہن عصا پر سوار ہو کر اسی دم واپس ہوئے، چونکہ وقت بہت کم تھا اور سورج مغرب کو جا رہا تھا۔

⁂

تھوڑی دیر کے بعد موہن اور شہزادی اڑتے ہوئے عصا کی مدد سے سبز قبا والے بوڑھے کے پاس سانپوں کے شہر میں پہنچ گئے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ لیکن مغرب کی طرف دیکھ کر اندازہ

ہوتا تھا کہ کوئی آدھ گھنٹے میں غروب ہو جائے گا۔ بوڑھے نے لعل ہاتھ میں لے کر کہا۔ "وقت بہت کم ہے۔ مگر چلو چلتے ہیں، اک آخری کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔"

بوڑھے نے عصا ہاتھ میں لیا اور موہن اور شہزادی کو ساتھ لے کے بلند مینار کی جانب روانہ ہوئے، جہاں سانپوں کے شہر کی سرکار رہتی تھی۔

راستے میں بوڑھے نے موہن اور شہزادی سے کہا: "مینار کے اندر گھسنے کی صرف ایک ترکیب ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھ لو۔ اس میں اگر ذرا بھی بھول چوک ہو گئی تو سب کام چوپٹ ہو جائیگا اور یوسف کسی طرح نہ بچ سکے گا۔"

"بتایئے۔" موہن نے کہا۔ "ہم اس پر عمل کریں گے۔"

بوڑھے نے کہا: "وہ سامنے مینار کا آہنی جنگلہ نظر آ رہا ہے۔ وہاں جا کے ہم تینوں رک جائیں گے۔ پھر مینار کے اندر سے ایک آواز آئے گی 'تم کون ہو' اس کے جواب میں صرف یہ کہنا 'ہم سرکار کے غلام ہیں۔' اس پر ہمیں آگے بڑھنے کی اجازت دی جائے گی۔ جب ہم مینار کے اندر والے پھاٹک پر پہنچیں گے تو ہمیں پھر رکنا پڑیگا۔ اس پھاٹک کے بیچ میں ایک سوراخ ہے۔ اس سوراخ

کے اندر سے وہ لوگ ہمیں جھانک کر دیکھیں گے اور اس بات کا پتہ چلائیں گے کہ ہم واقعی سرکار کے غلام ہیں یا نہیں۔"

"اس کا پتہ انہیں کیسے چلے گا کہ ہم سرکار کے غلام ہیں۔ یہ اور پھر ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہم سرکار کے غلام ہیں۔؟"

"دیکھو، وہ ترکیب میں تمہیں بتا ناچوں، جب تم اس دروازے کے پاس پہنچو تو خبردار اپنی پلکوں کو کسی حالت میں نہ جھپکانا۔ بس چپ چاپ ٹکٹکی باندھے سوراخ کی طرف دیکھتے رہنا۔ کسی حالت میں پلکیں نہ جھپکانا۔ سرکار کے غلاموں کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ پلکیں نہیں جھپکاتے، چپ چاپ ہاتھ باندھے حکم کی تعمیل کے لئے کھڑے رہتے ہیں۔ سمجھ گئے۔؟"

شہزادی نے کہا۔ "جی سمجھ گئے۔"

بوڑھے نے پھر خبردار کرتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ میں نے کہا ہے، اس پر حرف بہ حرف عمل کرنا۔ نہیں تو یوسف کی زندگی کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔"

اس کے بعد بوڑھا۔ موہن اور شہزادی، تینوں مینار کے باہر آہنی جنگلے کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ مینار کے اندر سے آواز آئی "کون ہے۔؟"

ان تینوں نے جواب دیا۔ "سرکار کے غلام۔"

"کیا کام ہے۔؟"

"سرکار کی غلامی چاہتے ہیں۔" بوڑھے نے کہا۔

"آگے بڑھو۔" آواز آئی۔

یہ تینوں آگے بڑھے۔ واقعی مینار کے بڑے پھاٹک کے اندر ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ اس کے قریب جا کر تینوں کھڑے ہو گئے۔ چند منٹ تک بغیر پلکیں جھپکائے کھڑے رہے حتیٰ کہ موہن کی آنکھوں میں جلن پیدا ہونے لگی۔ اور شہزادی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اگر چند منٹ تک اور اسی طرح کھڑے رہنا پڑتا تو شاید شہزادی کی پلکیں جھپک جائیں۔ مگر خیر ہوئی کہ تھوڑے عرصے کے بعد پھاٹک خود بخود کھلا۔ اور کھل کر خود بخود فوراً بند ہو گیا۔

مینار کے اندر جا کر بابا نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔ "اس زینے پر چڑھتے چلو۔ ہمیں پہلے سیدھے برف خانے کے اندر جانا چاہیئے۔ سورج غروب ہو رہا ہے۔"

بھاگتے بھاگتے وہ بہت سی سیڑھیاں طے کر گئے۔ اور عین اسی وقت جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ تینوں برف خانے کے اندر پہنچ گئے۔ اور بوڑھے نے وہ لعل یوسف کے ماتھے

سے لگا دیا۔

لعل نے ڈنک والی جگہ سے زہر چوسنا شروع کیا۔ اور اسوقت ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ جوں جوں لعل زہر چوستا جاتا تھا مینار کے اندر روشنی کم ہوتی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر میں برف خانے کے زینے پر سیکڑوں بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ قدم برف خانے کی طرف بھاگے چلے آرہے تھے۔ بابا نے آگے بڑھ کے برف خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

زہر پی کر لعل کی رنگت سبز ہوتی جا رہی تھی۔ یوسف کے چہرے پہ زندگی کی سرخی دوڑنے لگی۔ یکایک لعل نے سارا زہر چوس لیا۔ اور یوسف نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اس کے آنکھیں کھولتے ہی مینار میں چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ اور چاروں طرف سے سانپوں کی خوفناک پھنکاریں سنائی دینے لگیں۔

"لعل کہاں ہے۔؟ لعل کہاں ہے۔؟" بوڑھے نے گھبرا کے اندھیرے میں ٹٹولنا شروع کیا۔

"میرے ہاتھ میں ہے۔" یوسف نے چلا کے کہا

لعل کے اندر سے سبز رنگ کی روشنی پھوٹ پھوٹ کے نکل رہی تھی۔ چاروں طرف سے سانپوں کی پھنکاریں بڑھتی جا رہی تھی۔

نہ جانے سانپ کن تہ خانوں کے اندر سے ہوتے ہوئے برف خانے میں آرہے تھے۔

بابا نے چلا کے کہا۔ "جلدی کرو۔ اس لعل کو توڑ ڈالو۔"

یوسف نے بابا کے ہاتھ سے عصا لے لیا اور اس کی چاندی کی موٹھ کو لعل پہ مار مار کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

لعل کے ٹکڑے ہوتے ہی ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ چاروں طرف بجلی سی کوند گئی۔ اور اس بجلی کی روشنی میں بوڑھے نے دیکھا کہ مینار اوپر سے نیچے تک پھٹ گیا ہے۔ اور اڑا ڑا دھم کر کے ساری عمارت نیچے آرہی ہے۔

بوڑھے نے چلا کے کہا۔ "بھاگو بھاگو۔ یہاں سے فوراً بھاگو۔"

بوڑھے نے شہزادی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اور یوسف اور موہن کو عصا پر سوار کر کے مینار سے فوراً باہر نکل آیا۔ ان کے نکلتے ہی مینار کی ساری عمارت دھم سے نیچے گر پڑی۔

سارا شہر ہل گیا۔ بہت سے مکان گر گئے۔ شہر کے اوپر جو لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی، وہ تو صاف اڑ گئی اور شہر سے بہت دور جا پڑی۔ لوگ چیختے چلاتے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے

علاقے میں انہوں نے بہت سے چھوٹے چھوٹے سانپوں کو مرے ہوئے دیکھا۔ مینار کے پاس انہوں نے ایک عجیب تماشا دیکھا۔

انہوں نے دیکھا کہ مینار کے ملبے کے پاس بہت سے اژدہے اور خوفناک سانپ مرے پڑے ہیں۔ لعل جواہرات، قیمتی ساز و سامان کے ڈھیر بکھرے ہوئے پڑے ہیں اور ان کے قریب ایک سبز قبا والا بوڑھا کھڑا ہے اور اس کے ساتھ ایک لڑکی اور دو چھوٹے لڑکے ہیں اور وہ تینوں حیرت سے اس سارے منظر کو دیکھ رہے ہیں۔

لوگ بوڑھے کے پاس آکر دوزانو ہو گئے اور اس کا شکریہ ادا کرنے لگے کہ اس نے انہیں سانپوں سے نجات دلائی تھی۔

بوڑھے نے کہا۔ "میرا شکریہ ادا نہ کرو۔ ان تین ننھے بچوں کا شکریہ ادا کرو، جن کی بہادری سے تمہاری زندگیاں بچ گئی ہیں۔ آج کے بعد تمہیں کوئی سانپ نہیں کاٹے گا۔ سانپوں کی سرکار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی ہے۔"

لوگوں نے خوشی سے تینوں بچوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اور سارے شہر میں بڑی دھوم دھام سے انکا جلوس نکالا۔

اس رات یہ تینوں بچے بابا کے تہہ خانے میں سوئے۔ صبح اٹھکر یوسف نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا۔ اور درخت پر آگے بڑھنے کی اجازت

چاہی۔

بوڑھے نے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے جادو کے آئینے کو ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گیا۔

یوسف نے پوچھا "بابا ہم جائیں۔؟"

یکایک جادو کا آئینہ کام کرنے لگا۔ یوسف نے دیکھا کہ ایک جھونپڑا ہے اور اس کے باہر بہت سے آدمی جمع ہیں اور شور و غل کر رہے ہیں۔ یکایک یوسف نے پہچان لیا کہ یہ تو اس کا جھونپڑا ہے۔

بوڑھا کچھ نہ بولا۔ جادو کے آئینے میں دیکھتا رہا۔

پھر یوسف نے دیکھا کہ بہت سے سپاہی ایک کھاٹ اٹھا کر باہر لائے اور اسے زور سے پھینک دیا۔ کھاٹ پر سوئی ہوئی ایک بڑھیا گھبرا کے اٹھی اور چیخنے لگی۔ "یوسف، یوسف، تم کہاں ہو۔! بادشاہ کے سپاہی میرا گھر چھین رہے ہیں۔ یوسف میرے بیٹے تم کہاں ہو۔؟"

"ماں!" یوسف کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

بوڑھے نے پلٹ کر کہا۔ "تمہاری ماں مصیبت میں ہے۔"

"ہاں بابا۔" یوسف نے گھبرا کے کہا۔ "مجھے فوراً اس کی مدد کے لئے پہنچنا چاہیئے۔"

بابا نے جادو کے آئینے کے تار الگ کر دیئے اور آہستہ سے کہا۔
"تو چلو چلتے ہیں۔"

بابا نے عصا پر تینوں کو بٹھایا اور اُلٹے درخت کی شاخوں سے نیچے کو جانے لگے۔ اب تک یوسف اور اس کے ساتھی درخت کے اوپر چڑھتے آرہے تھے۔ مگر اب وہ واپس یوسف کے گھر کو جا رہے تھے۔

سیکڑوں میل تک نیچے اور نیچے درخت کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان شاخوں کے اوپر گویا تیرتے ہوئے، وہ تینوں جا رہے تھے۔

یکایک موہن نے پوچھا۔ "بابا اس شہر میں جسے ہم ابھی پیچھے چھوڑ کے آئے ہیں، وہ سانپ کہاں چھپے ہوئے تھے۔؟"

بابا نے کہا۔ "بیٹا وہ سانپ نہیں تھے وہ آدمی تھے اور آدمی کے بھیس میں لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ اور وقت اور موقع دیکھ کر ڈنک مارتے تھے۔ ایسے آدمی سانپوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ جو آدمی کے بھیس میں رہتے ہیں۔ اور لوگوں کو ڈستے ہیں۔"

"ایسے آدمیوں کی پہچان کیا ہے۔؟" شہزادی نے پوچھا۔

"بیٹی ایسے آدمیوں کے دل میں زہر بھرا رہتا ہے۔ اور ان کی آنکھوں میں پتلیوں کی بجائے چاندی کی ٹکلیاں ہوتی ہیں۔ اگر تم ان آنکھوں میں غور سے دیکھو تو تم ان کو بخوبی پہچان سکو گی۔ یہی وہ آدمی

ہیں۔ جو آدمیوں کو لوٹتے ہیں۔ اور ان میں جنگیں کراتے ہیں۔ ان آدمیوں کی آنکھوں میں پتلیاں نہیں ہوتیں، چاندی کی گول گول ٹکلیاں ہوتی ہیں۔"

عصا تیزی سے اڑا جا رہا تھا۔ اب درخت کا تنا نزدیک آرہا تھا اور شگاف سے روشنی بھی چھن کر آرہی تھی۔ تھوڑی دیر میں عصا نیچے اترتا ہوا شگاف کے باہر نکل آیا۔ اب وہ چاروں یوسف کے جھونپڑے کے باہر کے چھوٹے سے باغیچے میں تھے جہاں بہت سے گاؤں والے، گاؤں کا خوجہ، بادشاہ اور سپاہی جمع تھے۔ اور یوسف کی بڈھی ماں رو رو کر بیان کر رہی تھی۔

یوسف نے چلا کے کہا۔ "ماں۔"

ماں نے حیران ہو کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا پھر دوڑ کر اس سے بغلگیر ہوئی۔ وہ یوسف کا منہ چومتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔

یکایک بادشاہ نے غصے سے چلا کر کہا۔ "اسے بھی پکڑ لو۔"

بادشاہ کے سپاہیوں نے یوسف کو بھی پکڑ لیا۔

بوڑھے نے بادشاہ سے پوچھا۔ "اس غریب لڑکے کا کیا قصور ہے"

بادشاہ نے کہا۔ "یہ بھگوڑا ہے۔ یہ میری فوج میں لڑنا نہیں چاہتا۔ میں ساتھ والے غار پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے میری

فوج میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔"

بوڑھے نے کہا۔ "تم دوسرے ملک پر کیوں حملہ کرنا چاہتے تھے۔؟"

"مجھے دولت کی ضرورت ہے۔"

"تم کتنی دولت چاہتے ہو۔؟" بوڑھے نے پوچھا۔ اور اپنی قبا میں ہاتھ ڈال کے مٹھی بھر لعل و جواہر زمین پر بکھیر دیئے۔

بادشاہ اور اس کے سپاہی جلدی جلدی سے لعل و جواہر چننے لگے۔

بوڑھے نے دوسری بار جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک اور مٹھی لعل و جواہر نکالے اور انہیں الٹے درخت والے گڑھے میں پھینک دیا۔

چند سپاہیوں نے شگاف کے اندر چھلانگ لگا دی۔

بادشاہ نے اس بوڑھے سے کہا۔ "تم نے کیا کیا۔؟"

بوڑھے نے کہا۔ "میں نے تمہیں راستہ دکھایا ہے۔ ہم لوگ اس غار کے اندر سے آئے ہیں۔ وہاں اندر لعل و جواہر کی لاکھوں کانیں ہیں۔ وہاں تم اتنی دولت سمیٹ سکتے ہو جتنی یہاں کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔"

بادشاہ اور اس کی لالچی بیٹی، دونوں نے گڑھے میں چھلانگ لگا دی۔

یوسف نے چلا کے کہا۔ "ٹھیرو۔ ٹھیرو۔"

مگر بوڑھے نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "انہیں مت روکو۔ یہ سب لوگ اب گڑھے کے اندر جا چکے ہیں۔ اب تم جلدی سے اس شگاف

کو مٹی ڈال کے بھر دو۔"

یوسف حیران کھڑا رہا۔

بوڑھے نے مڑ کے گاؤں والوں سے کہا۔ "اگر تم بادشاہ سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہی وقت ہے۔ جلدی سے اس گڑھے کو مٹی ڈال کے بھر دو۔ کہیں بادشاہ لوٹ نہ آئے۔"

بات یوسف کی سمجھ میں آگئی۔

یوسف نے بیلچہ ہاتھ میں لے لیا۔ اور مٹی ڈالنے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی گاؤں کے دوسرے نوجوان بھی مٹی ڈالنے لگے۔ تھوڑی دیر میں سارے گاؤں نے گڑھے کو مٹی ڈال کے بھر دیا۔

جب گڑھا بالکل بھر گیا اور مٹی زمین کے برابر ہوگئی تو یوسف نے بڑی حسرت سے کہا۔ "مگر بابا اس کے اندر تو میرا درخت تھا۔"

بوڑھے نے کہا۔ "وہ درخت تو اب بھی موجود ہے۔ اس درخت پر چڑھ کے تم نے زندگی کا اتنا تجربہ حاصل کیا ہے۔ اب اس تجربہ سے اپنے گاؤں والوں کو بھی فائدہ پہنچاؤ۔ اس درخت نے جو کچھ تمہیں سکھایا ہے، وہ سب تم اپنے ہمسایوں کو سکھا سکتے ہو۔"

"مگر بابا میں تو پورے طور پر اس درخت پر چڑھا بھی نہیں۔"

یوسف نے کہا: "میں نے تو اس کی چوٹی بھی نہیں دیکھی۔ بابا مجھے

اس درخت کی چوٹی دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔"

بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹیا یہ کوئی معمولی درخت نہیں ہے۔ یہ انسان کی ترقی کا درخت ہے۔ اس کی چوٹی آج تک کسی نے نہیں دیکھی۔"

یوسف کے چہرے سے پریشانی اور حیرت دور ہو گئی۔ اس کے دل کے بہت سے تاریک کونوں میں روشنی پھیل گئی۔ یکایک اس کی سمجھ میں بہت کچھ آ گیا۔ اس نے بڑی عزت سے بابا کی قبا کو چوم لیا اور بولا "بابا تم نے مجھے بہت کچھ سکھایا ہے۔ میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کر سکتا ہوں۔ بس میں یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج سے یہ جھونپڑا آپ کا ہے۔ آج سے آپ ہمارے ساتھ رہو بابا۔ اس چھوٹے سے جھونپڑے میں۔ یہاں موہن بھی رہے گا اور یہ شہزادی بھی۔"

بابا نے شہزادی کے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ "یوسف سبھی چھوٹی لڑکیاں شہزادی ہوتی ہیں۔ تم اس کو اپنے گھر میں رکھو اور اپنے دوست موہن کو بھی۔ اپنی ماں کی خدمت کرو۔ اپنے گاؤں والوں کو اپنے علم اور تجربے سے فائدہ پہنچاؤ۔ میں چلتا ہوں۔"

"کیوں بابا آپ رکیں گے کیوں نہیں۔؟" موہن نے پوچھا۔

"رک جایئے۔" شہزادی نے بابا سے لپٹ کر بڑے پیار سے کہا۔

"رک نہیں سکتا بیٹی۔" بابا نے آہستہ سے کہا۔ "میرا کام رکنا نہیں۔ چلنا ہے۔ میں چلتا رہتا ہوں۔ ہمیشہ چلتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا نام تاریخ ہے۔"

یہ کہہ کر بابا نے پھڑ پھڑاتے پروں والے عصا کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور آگے چل پڑا۔ اور بہت دور تک یوسف، شہزادی اور موہن کی نگاہیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ آخر راستے کے ایک موڑ پر آ کے وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

یوسف کی ماں نے بڑے پیار سے یوسف اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بابا ٹھیک کہتا تھا۔ چلو۔ تمہارا گھر تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔"

اور یوسف نے موہن اور شہزادی کا ہاتھ پکڑا اور تینوں یوسف کی ماں کے پیچھے پیچھے پھولوں والی کیاریوں سے گزرتے ہوئے جھونپڑے کے اندر چلے گئے۔

٭

ختم شد

"رک نہیں سکتا بیٹی۔" بابا نے آہستہ سے کہا۔ "میرا کام رکنا نہیں۔ چلنا ہے۔ میں چلتا رہتا ہوں۔ ہمیشہ چلتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا نام تاریخ ہے۔"

یہ کہہ کر بابا نے پھڑپھڑاتے پردں والے عصا کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور آگے چل پڑا۔ اور بہت دور تک یوسف، شہزادی اور موہن کی نگاہیں اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ آخر راستے کے ایک موڑ پہ آ کے وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

یوسف کی ماں نے بڑے پیار سے یوسف اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بابا ٹھیک کہتا تھا۔ چلو۔ تمہارا گھر تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔"

اور یوسف نے موہن اور شہزادی کا ہاتھ پکڑا اور تینوں یوسف کی ماں کے پیچھے پیچھے پھولوں والی کیاریوں سے گزرتے ہوئے جھونپڑے کے اندر چلے گئے۔

٭

ختم شد

فن

● "کرشن چندر میں سب سے مقدم چیز اُن کا منفرد نقطۂ نظر ہے۔ وہ۔ سب سے پہلے بھی کرشن چندر ہے اور سب سے آخر میں کرشن چندر۔ اس نے مخصوص تحریک یا نقطۂ نظر کو اپنے اُوپر غالب نہیں ہونے دیا ہے۔ نہ تو پرولتاریت کو، نہ جنس کو، نہ رومانیت کو محض ترقی پسندی کو بھی نہیں۔ وہ زندگی کو دیکھنے کے لئے کسی مخصوص رنگ کے شیشوں کی مدد نہیں لیتا۔ اُس کو اپنی آنکھوں پر پورا اعتماد ہے۔ اس کا افسانہ زندگی کا ایک ذاتی اور بلاواسطہ تاثر ہوتا ہے۔"

—— محمد حسن عسکری

● "فن اور وسیلۂ اظہار کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی مواد اور موضوع کی۔ بلکہ اس میں تو ایسا جادو ہے کہ کبھی کبھی یہ مواد کی سطحیت کا پردہ پوش بن جاتا ہے۔ اور زبان و بیان کے رسیا اسی کے چند گھونٹ پی کر مست ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو تنہا اسلوب پر فن کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے نہ اُس کو نظر انداز کر کے۔ کرشن چندر افسانہ نویسی کے اس اہم ترین بھید سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اُس کو برتنے پر قدرت رکھتے ہیں۔"

—— سیّد احتشام حسین

● "کرشن چندر اندر سے سراسر شاعر تھا۔ اُس نے اپنے افسانوں سے شاعری کی شبنم جھاڑنے کی کوشش کی مگر اس میں ناکام رہا۔ اور اچھا ہی ہُوا کہ ناکام رہا اور اس طرح محبت، اپنائیت اور اجتماعیت اس کے افسانوں کا مجموعی تاثر بنی۔"

—— احمد ندیم قاسمی

● "وہ اپنے خوبصورت اندازِ بیان کے خود ہی مُوجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ ان کے اسٹائل کا اگر تجزیہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اُس میں ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو عموماً ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں مثلاً رُومان، مزاح اور حقیقت۔ مزاح ایک ایسا عنصر ہے جو رُومان کے حق میں زہرِ قاتل ہوتا ہے۔ اور رُومان وہ عنصر ہے جو حقیقت کو تباہ کر دیتا ہے لیکن کرشن چندر کے اسلوبِ بیان میں وہ نہ صرف اچھے ہمسایوں کی طرح رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ گھُل مِل بیٹھتے ہیں۔ کرشن چندر قدرت سے ایک شاعر کا دل، ایک فلسفی کا دماغ اور ایک مجاہد کا جگرا لے کر پیدا ہُوئے تھے۔ یہ نظریۂ اشتراکیت کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے کرشن چندر ایسا مبصر اور مبلغ ملا جس نے کارل مارکس کے خشک اور سنجیدہ فلسفہ کو اس دلکشی اور رعنائی کے ساتھ پیش کیا کہ وہ عمر خیام کی رُباعی اور شعرِ حافظ سے بھی زیادہ دلآویز نظر آنے لگا۔"

—— کنہیا لال کپور